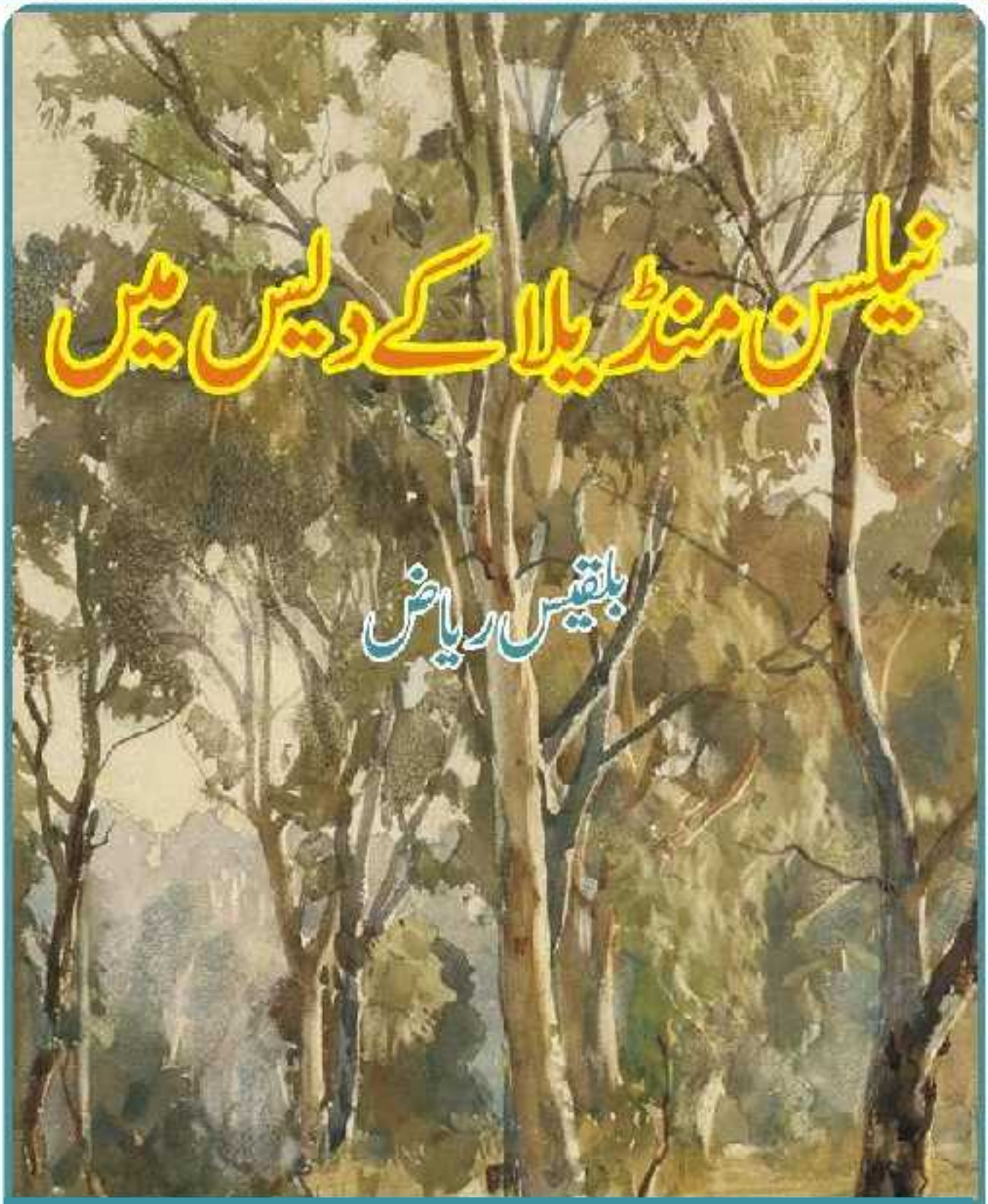
نیلسن منڈیلا کے دیس میں
بلقیس ریاض

# نیلسن منڈیلا کے دیس میں

سفرنامہ

بلقیس ریاض

# نیلسن منڈیلا کے دیس میں

ساؤتھ افریقہ میں Envir'O Law 2002 پر کانفرنس ہو رہی تھی۔ دنیا کے پچپن ممالک سے چیف جسٹس صاحبان' سپریم کورٹ کے ججز' ہائیکورٹ کے ججز کے علاوہ بہت سے وکلاء اور لاء کالج کے لیکچرار شرکت کر رہے تھے۔ چیف جسٹس آف پاکستان شیخ ریاض احمد اس کانفرنس میں مدعو تھے۔ پاکستان کے خاص نمائندے تھے۔ ان کے علاوہ میرا بھی دعوت نامہ تھا۔ کیونکہ تمام ججز کی بیگمات بھی شمولیت کے لیے ساؤتھ افریقہ کے شہروں جوہانسبرگ اور ڈربن میں آ رہی تھیں۔ اس لیے میرے لیے جانے میں کوئی رکاوٹ درپیش نہیں تھی۔

اس دور میں ماحولیات کا موضوع نہایت اہم ہو چکا تھا۔ کیونکہ انسان بڑی بے دردی سے کرۂ ارض کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہمارے اپنے ملک کو دیکھ لیں' ہم درختوں اور پودوں اور اپنے جنگلات کے دشمن ہیں۔ بے رحم لوگوں نے شمالی علاقے کے جنگلات کاٹ کاٹ کر بیچ ڈالے۔ موٹروں' کاروں اور رکشوں کی بھرمار اور ان سے نکلنے والے دھوئیں نے انسانی زندگی دوبھر کر دی ہے۔ تازہ ہوا اور اس میں سانس لینا ان بڑے شہروں میں عنقا ہو چکا ہے جس سے بیماریاں تیزی سے پھیل رہی ہیں اور ان تمام چیزوں سے بالا موٹروں کے ہارنوں کا شور اور بسوں ٹرکوں نے انسانی زندگی کم کر دی ہے۔ فیکٹریوں کے دھوئیں اور صنعتی آلودگی نے بھی تمام ماحول کو پراگندہ کر رکھا ہے۔ دور نہ جایئے اسلام آباد جیسے جدید شہر کے پڑوس میں سیمنٹ فیکٹری لگ گئی ہے جس کی وجہ سے اسلام آباد کی آب و ہوا متاثر ہوئی ہے۔ درخت اور جنگل کاٹ کاٹ کر اسے سیمنٹ اور کنکریٹ میں تبدیل کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے تازہ سبزی شہروں کو نہیں مل رہی ہے۔ ہر شہر کے اردگرد کا سرسبز علاقہ اس شہر کے پھیپھڑے کا کام دیتا ہے جسے ہم تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ماحول کی پراگندگی نہ صرف پاکستان کا مسئلہ ہے بلکہ تمام دنیا کے لیے ایک مسئلہ بن چکا ہے اور دنیا کے تمام دانشور اس پر غور کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں تمام دنیا کی عدلیہ کے چیف جسٹس صاحبان کی اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد جوہنسبرگ میں ۱۸ اگست کو ہوا اور ۲۲ اگست کو ساؤتھ افریقہ کے دوسرے شہر ڈربن میں کانفرنس منعقد ہوئی۔

جوہنسبرگ (Johanes Burg) کی کانفرنس میں عدلیہ نے بیک آواز اس کا عہد کیا کہ وہ ماحول کی پراگندگی دور کرنے کے

لیے اس سلسلہ میں بھرپور کوشش کریں گے اور تمام قانون کا ذکر کیا گیا جس میں ہر قسم کی آلودگی سے نمٹنے اور اسے ختم کرنے کے لیے قانونی شقوں کا ذکر کیا گیا اور اس قانون کو کانفرنس میں آئے ہوئے لوگوں نے سراہا۔ اس کانفرنس میں چیف جسٹس آف پاکستان شیخ ریاض احمد نے یہ بھی بتایا کہ ماحولیات کی ایک علیحدہ ڈویژن بنادی گئی ہے اور ایک کونسل بھی جو کہ ایک وزیر کے تحت کام کرتی ہے اور اسی قانون کے تحت ووٹر میونسپل بھی تشکیل دیئے گئے ہیں جو مقدمات سنیں گے اور ضروری احکامات جاری کریں گے اور یہ بھی کہ سزا بھی دے سکتے ہیں۔ ماحول کی پراگندگی کو جرم تصور کیا گیا تھا۔

بلوچستان میں زیارت کے علاقہ میں صنوبر کے جنگلات پر کڑی پابندگی لگائی گئی ہے اور لوگوں کے لیے گیس کے سلنڈروں کی سپلائی اور اس کی ترسیل آسان کی گئی ہے تاکہ لوگ صنوبر کے جنگل کو ایندھن کے طور پر استعمال نہ کریں۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے یہ بتایا کہ ماحول کی پراگندگی کے سلسلہ میں پاکستان کی سپریم کورٹ کا کردار مثالی ہے کیونکہ سپریم کورٹ نے از خود نوٹس لیتے ہوئے اسلام آباد میں بجلی کا گرڈ لگانے سے واپڈا کو منع کر دیا اور اس سلسلے میں کوئلے اور نمک کی کانوں سے نقصان دہ پانی کا اخراج جو کہ پینے کے پانی میں مل رہا تھا اس کی روک تھام کی اور واہگہ کے ریلوے اسٹیشن سے گندگی کا ڈپو اٹھانے کا حکم دیا۔

مختصر یہ کہ دونوں کانفرنسیں بڑی کامیاب رہیں۔ دنیا کے تمام ممالک اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے احساس کرتے ہوئے ایسے اقدامات کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں جس سے انسانی زندگی بچے اور وہ صحیح طور پر جیئے اور قدرت کے عطیات کا بھرپور طریقے سے افادہ حاصل کریں۔

صاف پینے کے پانی کی اہمیت کا بھرپور زور دیا گیا تھا اور یہ عہد کیا گیا کہ غربت کا خاتمہ بھی ہو۔ پاکستان میں اس سمت یعنی غربت ختم کرنے کے احکامات کا بھی ذکر اس کانفرنس میں کیا گیا۔

ساؤتھ افریقہ جانے کے لیے ایمریڈ ائیر لائن کو ترجیح دی جو کہ کراچی سے دوبئی اور دوبئی میں دو گھنٹے (قیام) کے بعد سیدھی ساؤتھ افریقہ کے شہر جوہانسبرگ جاتی تھی۔ اسلام آباد سے کراچی تقریباً پونے دو گھنٹے لگے۔ سیدھا دوبئی جانے کی بجائے ہم نے ایک ہفتہ کراچی رہنا تھا اور اس کے بعد جوہانسبرگ کے لیے فلائیٹ پکڑنی تھی۔ میرے میاں کراچی میں ایک ہفتہ ڈیوٹی پر تھے اور ایک ہفتہ پل بھر میں ہی گزر گیا تھا۔ جمعہ کے روز رات گیارہ بجے کی فلائیٹ تھی اور دس بجے ائیر پورٹ کی جانب چل پڑے تھے۔ ہمیں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے بتایا گیا کہ جہاز کے اڑنے میں کچھ تاخیر ہے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ نیند خواہ مخواہ ہی ایسی جگہوں پر آجاتی ہے۔ دل میں بے چینی تھی کہ جہاز پہلے دوبئی اور اس کے بعد جوہانسبرگ جائے گا۔ جہاز کے عملے نے بورڈنگ شروع کر دی

تھی اور مسافروں کو سوار کرنے کے بعد کافی دیر تک جہاز میں بٹھایا گیا تھا۔ پھر ایک گھنٹہ بٹھانے کے بعد کہا گیا کہ جہاز میں کوئی ٹیکنیکل خرابی ہے جس کے باعث صبح پانچ بجے تک آپ کو لاؤنج میں بیٹھنا پڑے گا۔

ایک تو نیند کا غلبہ۔۔۔۔۔۔۔اور دوسرے رات بھر جاگنے کا خوف دامن گیر تھا۔ سفر' سفر ہی ہوتا ہے۔ چاہے کتنا ہی آرام دہ کیوں نہ ہو۔ انسان کو تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ''صبح پانچ بجے تک'' میری پریشانی سے پوری آنکھیں کھل گئیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں اپنے میاں کے ہمراہ لاؤنج میں چلی گئی تھی۔ ائیر پورٹ کا نقشہ بھی بڑا ہی عجیب وغریب تھا۔ کوئی کرسیوں پر' کوئی لاؤنج کے ایک کونے پر سوئے ہوئے ملے۔ سامنے چائے کا سٹال تھا' کچھ لوگ وہاں کھڑے چائے کے ساتھ سنیک لے رہے تھے۔ اپنی اپنی منزل پر جانے کے لیے بے تاب تھے۔ نیند آنکھوں میں سوار تھی مگر بے چینی سے وقت کا انتظار تھا۔ لوگ خراماں خراماں آنے شروع ہو گئے تھے۔ ساڑھے چار بجے دوبئی کے لیے بورڈنگ شروع ہو گئی تھی۔

ایک گھنٹہ اور چالیس منٹ کا راستہ تھا۔ اتنا جتنا کہ کراچی سے لاہور یا کراچی سے اسلام آباد۔ رات بھر جاگنے سے بے انتہا تھکن ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے جہاز چلا اور پونے دو گھنٹے میں دوبئی پہنچ گیا۔ جو اگلا جہاز ہم نے پکڑنا تھا وہ اس جہاز کے لیٹ ہونے سے جا چکا تھا۔ اور پھر معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ ایک جہاز ساؤتھ افریقہ جوہانسبرگ صبح پانچ بجے جائے گا۔ تب تک آپ کو ہوٹل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ صبح پانچ بجے۔۔۔۔۔۔۔میرا دل بیٹھ گیا۔ ایک اور رات خواری کی گزرنی تھی۔ لیکن نئی جگہ کا شوق بھی تھا اور لوگوں سے تعریف بھی سنی تھی کہ ساؤتھ افریقہ بہت خوبصورت ہے۔ جب بھی باہر جاتی ہوں تو میری ساس کے بول کانوں میں گونجتے ہیں۔ سب جگہیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سمندر' پہاڑ' سڑکیں مکان۔۔۔۔۔۔۔صرف لوگوں کے رنگ اور نسل میں فرق ہوتا ہے۔ بات تو ان کی مجھے بڑی پتے کی لگتی ہے۔ کوئی شک نہیں جگہیں' ایک جیسی ہوتی ہیں مگر ہر جگہ کا اپنا چارم (Charm) ہوتا ہے اپنی خوبصورتی ہوتی ہے۔

دوبئی پہنچے تو ایمبیسی سے عمران فارن آفیسر اور ان کا عملہ لینے کے لیے آیا ہوا تھا اور ان کی گاڑی میں ہوٹل Rotana جو ائیر پورٹ کے قریب دوبئی کے اچھے ہوٹلوں میں ایک تھا۔ جب ہوٹل میں قدم رکھا تو ماربل کا صاف ستھرا فرش اور عمدہ فرنیچر دیکھنے کو ملا۔ بڑی بڑی راہداریاں عبور کر کے لفٹ کے ذریعے کمرہ نمبر ۳۷۱ میں پہنچ گئی۔ اس وقت صبح کے دوبئی کے حساب سے پانچ بجے تھے۔ اور دل یہی چاہتا تھا کہ بستر پر گر جائے۔ اس قدر تھکن تھی کہ دوبئی کے مال دیکھنے کے لیے بھی ان آفیسرز کو نہیں کہا تھا۔ جب انہوں نے پوچھا کہ گاڑی کس وقت بھیجی جائے تو جواب دیا۔۔۔۔۔۔۔پانچ چھ گھنٹوں کے بعد۔

بستر پر لیٹتے ہی ہوش نہ رہا۔ جب نیند چار پانچ گھنٹے مسلسل سونے سے پوری ہوگئی تو میرے میاں نے مجھ سے کہا' تیار ہو جاؤ نیچے کھانے کے لیے جانا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ دوپہر اور رات کے کھانے کے واؤچر دیئے گئے تھے۔ ائیر لائن میں غفلت ہو جائے تو وہ مسافروں کو ٹھہرانے کا بندوبست بھی کرتی ہے۔

نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچی تو نقشہ بالکل امریکہ اور یورپ کا تھا یا ہمارے فائیو سٹار ہوٹلوں کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔ بوفے لگا تھا' مختلف قسم کے سلاد' مختلف ڈشز پر مبنی کھانا ۔۔۔۔۔۔۔ سب کچھ ملتا جلتا تھا مگر وہاں بیٹھنے والے لوگ مختلف تھے۔ کسی خاتون نے پینٹ' کسی نے عبایا (کالا برقعہ) کسی نے سکرٹ' غرض کہ ہر طرح کا باشندہ کھانا تناول کرنے میں مصروف تھا۔ چیز کا استعمال بہت کیا ہوا تھا۔ تبھی عربی صحت مند دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں مختلف ممالک کے لوگ تھے وہاں خاص کر عربی ادھر سے ادھر اپن خاص سفید رنگ کے یونیفارم میں (جو لمبے چوڑے تھے) چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ عربی بولتے تھے یا ٹوٹی پھوٹی انگریزی۔ کھانے کے بعد چار بجے ایمبیسی کی گاڑی ہمیں مختلف پلازہ میں لے جانے کے لیے آ گئی تھی۔

ڈرائیور نے مجھ سے کہا۔

''بیگم صاحبہ آپ کو ایسے پلازہ میں لے جاتا ہوں جو شہر کے درمیان ہے۔ گھوم پھر لیں گی اور کچھ خریداری بھی کر سکیں گی۔'' وہ ہمیں ایک بہت بڑے پلازہ میں لے جاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''دو تین گھنٹے بعد واپس لینے کے لیے آؤں گا۔'' اور چلا گیا۔

ڈرائیور کا نام قلندر تھا۔ سفید داڑھی' نام کی مناسبت پر رکھی لگتی تھی۔ پاکستانی تھا' اخلاق سے پیش آیا۔ پردیس میں اتنا ہی کافی ہے کوئی اخلاق سے پیش آ جائے۔

پلازہ کے اندر داخل ہوئی تو بہت بڑے کمپاؤنڈ کی اونچی سی چھت تھی۔ صدر دروازے کے سامنے چھت سے لے کر فرش تک سامنے کی دیوار پر آبشار چل رہی تھی۔ دائیں جانب کھانے پینے کے مختلف سٹال لگے ہوئے تھے۔ فوڈ ایریا بھی بہت بڑا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب ایکسی لیٹر اوپر نیچے آنے کے لیے لگے تھے۔ زیادہ تر کالے بایوں (برقعوں) میں عربی عورتیں اور ان کے ساتھ بچے دکھائی دے رہے تھے۔ فیشن ۔۔۔۔۔۔۔ برائے نام تھا۔ اگر کوئی پاکستانی خاتون بھی بچوں کے ساتھ تھی تو سادے لباس میں ۔۔۔۔۔۔۔ کسی کی قمیص چھوٹی اور کسی کی لمبی۔ پاکستان کی طرح خواتین بنی سنوری دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اوپر کی منزلوں میں بچوں' بڑوں کے ملبوسات اور جوتے دستیاب تھے۔

چیزوں کی قیمتیں مہنگی تھیں' لندن امریکہ کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔ یا پلازہ مہنگا تھا۔ دوبئی کے باقی بازاروں میں گھومنے پھرنے کا

اتفاق نہیں ہوا تھا' اس لیے ہر شے مہنگی دکھائی دے رہی تھی۔ ریستوران میں بیٹھی Onion رنگ کے ساتھ چائے پینے لگی تھی۔ کھانے پینے کی کوالٹی بالکل باہر کے ملکوں کی طرح تھی۔ یہ نہیں کہ باسی چیز ہے تو وہ بھی پاکستان میں سب سے پہلے فروخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باہر اگر چیز پسند نہیں آئی یا کسی قسم کی شکایت کر دیں گے تو وہ اس چیز کو بدل کر اس سے بہتر لے آئیں گے۔ امیر ملک ہوتے ہیں' باتیں بھی امیرانہ ہوتی ہیں۔

عربی خواتین بھی یہاں پر آزادی سے گھومتی پھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ سعودی عرب کی زندگی سے ہٹ کر زندگی تھی ان کے لیے یہاں دوبئی کی سیر کسی غنیمت سے کم نہیں تھی۔ آزادانہ اور کھلے دل سے شاپنگ میں مصروف دکھائی دیتی تھیں۔ عجیب ہی شہر تھا جہاں ان کے علاوہ امریکن اور یورپین عورتیں اپنے مخصوص لباسوں میں گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں پر دن کے وقت تیز روشنیاں جل رہی تھیں جس سے وہ شاپنگ مال جگمگاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کئی دکانوں پر کرسٹل کی بھرمار تھی۔ اٹلی' جاپان' کوریا اور تھائی لینڈ کے دکھائی دے رہے تھے۔ اسی طرح بجلی کا سامان جو کئی ملکوں سے امپورٹ ہو کر آیا تھا اس کی دکانیں بھی بہت تھیں۔ شاپنگ کے لحاظ سے لوگ لندن امریکہ کی بجائے یہاں دوبئی آیا کرتے تھے۔ دور کیا جانا' کراچی سے ڈیڑھ گھنٹے کی فلائیٹ ہے۔ جن کے پاس روپیہ ہے ان کے لیے تو دوبئی آنا کوئی مشکل نہیں ہے' مگر سیر کے لیے آئیں تو کوئی بات نہیں۔ اگر شاپنگ کے لیے آتے ہیں تو ان کی بھول ہے۔ ہر چیز یہاں سے بہتر اور سستے داموں میں مل جاتی ہے۔ مگر دل کی تسلی کے لیے لوگ دوبئی آ کر شاپنگ کرتے ہیں۔

دوبئی وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ یہاں کی سجاوٹ اور آرائش دوبئی کے رہنے والے رئیس لوگوں کی طرح تھی۔ بڑے بڑے قیمتی صوفے' ماربل کے چمکتے ہوئے فرش اور پروٹوکول آفیسر' سفید چوغوں میں خاطر تواضع کر رہے تھے۔ جہاز اڑانے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ فارن آفیسر عمران اور امین ہمیں جہاز میں بٹھانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہماری رات تو جاگتے ہوئے گزری تھی۔ لیکن ان لڑکوں کو دیکھ کر رحم آ رہا تھا۔ خواہ مخواہ ہی وہ جاگے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئے تھی لیکن دیار غیر میں اپنی ڈیوٹی نبھا رہے تھے۔

جہاز کا وقت ہوا۔ جب بورڈنگ شروع ہوئی تو میں نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ ان کی بھی نجات ہوئی ہے۔ یہ بھی جا کر کام سے پہلے سو سکیں گے لیکن صبح کے پانچ بج گئے تھے۔ گھر پہنچتے پہنچتے سونے کے لیے وقت نکل جانا تھا۔ لہٰذا بورڈنگ پاس ان سے لیے

شکر یہ ادا کیا اور جہاز میں بیٹھ گئے۔ تھکن ہمیں بھی بے انتہا تھی مگر جہاز میں بیٹھتے ہی سوچا کہ سو جائیں گے مگر نیند اڑ سی گئی تھی۔

ائیر ہوسٹس ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔ اپنی ڈیوٹی اور فرائض کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ میں سیٹ پر بیٹھی ہوئی سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی تھی۔ نیند تو کوسوں دور تھی' سیٹ کے سامنے اگلی سیٹ کی پشت پر چھوٹی سی سکرین ویڈیو اور ٹی وی دیکھنے کو لگی ہوئی تھی۔ جہاز میں اناؤنسمنٹ ہونے لگی کہ ٹھیک آٹھ گھنٹے کے بعد جوہانسبرگ میں جہاز لینڈ کر جائے گا۔

''آٹھ گھنٹے'' یہ سن کر صبر و شکر کیا اور ائیر ہوسٹس کی بات سننے لگی۔

وہ جوسز لے آئی تھی۔ اورنج جوس کا گلاس میں نے لے لیا' پی کر سوچا کہ سو جاؤں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ناشتہ کے لیے ٹرالی چلی آ رہی تھی۔ دو لڑکیاں خوبصورت جوان ناشتہ لیے ٹرے بڑھا رہی تھیں۔ آرام کرنے کا وقت شاید جہاز میں بھی نہیں تھا۔ ناشتہ کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں تا کہ کوئی اور کھانے پینے کے لیے نہ پوچھ لے۔

زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان تھک جاتا ہے تو سوچتا ہے کہ اب دوبارہ سے اتنا لمبا سفر نہیں کرے گا' مگر جب تھکن اتر جاتی ہے تو وہ پھر سفر کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہی حال آج کے سفر میں ہوا تھا۔ سیاحت کا شوق بہت ہے مگر سفر کرنے کی چور ہوں۔

ٹھیک آٹھ گھنٹوں کے بعد جوہانسبرگ کے ائیر پورٹ پر جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ جہاز سے اترتے ہی ایمبیسڈر آف پاکستان اور ان کے ساتھ پروٹوکول آفیسر تھے اور کمرشل کونسلر زاہد صاحب تھے۔

وہ خندہ پیشانی سے ملے۔ لاؤنج میں لے آئے اور امیگریشن کے لیے اپنے پروٹوکول آفیسر کے ذریعے پاسپورٹ بھجوا دیئے تھے۔ وہ ریاض کے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے۔ بااخلاق اور ملنسار دکھائی دے رہے تھے۔ تقریباً پندرہ یا بیس منٹ کے بعد ہمارے ساتھ ہوٹل کی جانب چل پڑے۔ گاڑی جوہانسبرگ شہر کی جانب چلنے لگی تھی۔ ائیر پورٹ شہر سے کافی دور تھا اور جوہانسبرگ کا دیہی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ مٹی کا رنگ سرخی مائل اور زمین کا سبزہ سوکھ گیا تھا۔ جا بجا سوکھا سبزہ نظر آنے لگا تھا۔ بالکل مجھے سیون شریف کا راستہ دکھائی دینے لگا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ جوہانسبرگ بڑا ہی خوبصورت شہر ہے۔ مگر جب سے گاڑی چلی تھی کوئی اس کی خوبصورتی نظروں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ چار سو۔۔۔۔۔۔۔ درخت سوکھے ہوئے کوئی ہریالی نہیں۔ اور کھیت ویران سے دکھائی دینے لگے تھے۔ ائیر پورٹ سے ہوٹل تک کا راستہ بنجر پہاڑ سوکھا سبزہ۔۔۔۔۔۔۔ اور کہیں کہیں سبزہ بھی نگاہوں کے سامنے آنے لگا۔ بڑا ہی خاموش سا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اندر سے شہر خوبصورت ہو۔'' یہ سوچتے ہوئے میں نے زاہد صاحب کمرشل کونسلر سے

پوچھا۔

''کیا سارا شہر ایسا ہی ہے؟''۔

''آج کل ہریالی نہیں' آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔ بڑا خوبصورت شہر ہے' آپ دیکھیں گی تو بہت پسند کریں گی۔ بس فرق تھوڑا سا یہ ہے کہ ڈربن کی طرح نہیں ہے۔ یہاں پر سمندر نہیں۔ بعض لوگوں کو ڈربن بہت پسند آتا ہے۔ کیونکہ وہ رونق والا شہر ہے وہاں سارے شہر میں بیچ نظر آتی ہیں۔ خوبصورتی کے لحاظ سے یہ بھی بہت اچھا شہر ہے۔ آپ جب یہاں کے مقامات دیکھیں گی تو بہت پسند کریں گی۔ درختوں کا سرخی مائل زمین کا اور سوکھے گھاس کا سلسلہ چل رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں پتہ ہی نہ چلا اور ہوٹل Kopanong آ گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک سیاہ فام خاتون جو کہ کاؤنٹر پر بیٹھی تھی' سے ریاض نے اپنا تعارف کروایا تو اس نے ایک کتابوں کا بریف کیس اور کمرے کی چابی ہاتھ میں پکڑا کر کہا۔ ''ہوٹل کے بائیں جانب چھوٹی چھوٹی کاٹیج ہیں' وہی آپ لوگوں کے کمرے ہیں۔''

یہ ہوٹل شہر سے کافی دور تھا۔ اس میں خاصی گہما گہمی تھی۔ ہوتی بھی کیوں نا' ۵۵ ملکوں کے چیف جسٹس صاحبان اور دنیا بھر کے لائیرز اور ججز آئے ہوئے تھے۔ جو آ چکے تھے وہ کمروں کی چابیاں لے چکے تھے اور جو آ رہے تھے ان کو بھی کتابوں کے بریف کیس دیئے گئے جن میں کانفرنس کا پروگرام' کھانوں کے ٹائم اور دیگر مقامات کی سیر وغیرہ درج تھی۔

میں ریاض کے ساتھ سامان رکھوانے کے لیے ہوٹل کے باہر کاٹیج کی جانب چل پڑی۔ وہاں ہوٹل کے پوش کمروں کی بجائے پرانے سٹائل کی کاٹیجز فاصلے فاصلے پر خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ہر جھونپڑی کے پاس گاڑیاں آ جا سکتی تھیں۔ چابی کے ذریعے نمبر کے مطابق کمرے کو کھولا تو صاف ستھرا کمرہ جہاں رائٹنگ ٹیبل' ٹی وی' فریج اور پلنگ کے علاوہ صاف ستھرا غسل خانہ بھی تھا۔ وہاں خاموش فضا تھی۔ دور دور تک کاٹیجز دکھائی دے رہی تھیں۔ اجاڑ جگہ پر وہ جھونپڑیاں تھیں تو مجھے ان کو دیکھ کر بابرا کارٹ لینڈ کے ناول یاد آ گئے تھے۔ ہیروئین اس طرح کی کاٹیج میں رہتی ہے اور دور دیس سے ہیرو گھوڑے پر بیٹھ کر آتا ہے۔ اور ہیروئین سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ یہ تو اس وقت ناولوں میں پڑھ کر دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ ایسی کاٹیجز کا تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب زمانہ بیت چکا تھا' قدریں بدل گئی تھیں۔ خاموشی اور ویران جگہ کی بجائے ہنگامہ اور ہلہ گلہ جیسی جگہوں سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔ کہاں ہیروئین پوری آستین کا پھولا اور لمبا سا فراک پہنتی تھی اب اس کی جگہ پینٹ اور بلاؤز یا سکرٹ نے لے لی تھی۔ خواتین لباس بھی برائے نام پہنتی تھیں۔ خیر' میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنا سامان کھولا الماری میں کپڑے لگائے اور استری کو ڈھونڈا تو وہ نظر نہ آئی تو ہوٹل کی ریسپشنسٹ کو فون کیا۔ اور تھوڑی

دیر کے لیے میں بستر پر آرام کرنے لگی۔

دو دن کی تھکاوٹ تھی۔ میاں سیدھے کانفرنس اٹینڈ کرنے چلے گئے تھے اور میں بستر پر لیٹے لیٹے سو گئی تھی۔ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے سوئی ہوں گی کہ دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ ریاض اندر داخل ہوئے اور ساتھ ہی ایک سیاہ فام نیگرس استری اور سٹینڈ لے آئی۔ میں نے ایک کونے میں اسے رکھا اور اپنے اور ریاض کے کپڑے استری کرنے لگی۔ نہ جانے وہاں کیوں مجھے اداسی محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر طرح کی آرام دہ کاٹج تھی۔ بس' چار سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ریاض تو آرام کرنے کے لیے بستر پر گر گئے اور استری کے بعد میں باہر کا نظارہ لینے کے لیے نکل گئی۔ ان تمام جھونپڑیوں کے درمیان فوارہ اور چاروں طرف ایک تالاب تھا۔ فوارہ مدھم موسیقی بکھیرتے ہوئے چل رہا تھا۔ اس کا سارا پانی تالاب میں اتر رہا تھا۔ آسمان بھی خاموش تھا۔ کوئی چرند پرند درختوں پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فضا میں خاصی خنکی تھی۔ موسم بڑا دلفریب تھا۔ کہاں پاکستانی اور دوبئی کی گرمی اور کہاں یہاں کا موسم۔۔۔۔۔۔ حیرت کی بات تھی' قدرت کا کرشمہ تھا۔ کہیں گرم علاقہ اور کہیں سرد۔ مندوبین کی چہل پہل اپنے اپنے کمروں کی طرف جاتے آتے محسوس ہو رہی تھی۔ فوارہ مسلسل چل رہا تھا' گو کہ خنکی تھی۔

زندگی کا سلسلہ بھی اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ نہ جانے کتنے ٹورسٹ اور کتنے کانفرنس کے مندوبین یہاں پر آتے رہے ہوں گے۔ اس نظارے کو اپنی آنکھوں میں سموتے رہیں گے۔ مگر وقت کی رفتار تھمتی نہیں' وہ چلتی رہتی ہے۔ اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اسی طرح زندہ رہنے کے لیے سانس چلتی ہے۔ اسے صرف موت روک سکتی ہے' کوئی اور نہیں۔ میں نے اوپر آسمان کی جانب دیکھا تو ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مگر سوکھے درخت اس ہوا سے جھوم نہیں سکتے تھے۔ وہ سیدھے اسی حالت میں کھڑے تھے۔ لوگ ایک کاٹج سے نکل کر باہر اور باہر کے لوگ اپنی اپنی کاٹج کے اندر جا رہے تھے۔ خوشگوار دوپہر بھی سہانی تھی۔ فضا خنک' موسم ابر آلود مگر مجھے وہاں زندگی کی کوئی رونق دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی میں وہاں کھڑی ہی تھی کہ کمرشل کونسلر آف پاکستان زاہد صاحب میرے قریب آئے اور پوچھنے لگے کہ ''ایمبیسڈر صاحب کی اہلیہ کو آپ وقت دے دیں' وہ آپ کو گھمانا چاہتی ہیں۔''

''کب آنا چاہتی ہیں؟''

''کل آئیں گی۔''

''کتنے بجے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کو جو وقت سوٹ کرتا ہے' بتا دیں۔''

''ٹھیک ہے' کل گیارہ بجے کا وقت ان کو دے دیں۔''

زاہد صاحب نے پھر کہا۔

''آپ اس وقت فارغ ہیں۔۔۔۔۔۔۔کہیں تو جوہانسبرگ کی سیر کروادوں اور جو سوغاتیں افریقہ کی لینا چاہیں تو وہ بھی لے لیتے ہیں۔''

آرام تو میں کر ہی چکی تھی سو میں نے ان سے کہا' میں میاں سے پوچھ کر آپ کو بتاتی ہوں۔ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ریاض بھی آرام کر چکے تھے۔ میں نے جب ان سے پوچھا تو وہ رضامند ہو گئے جانے کے لیے۔

''بھابی! آپ کو یہاں سے ہی لے لیتا ہوں۔ گاڑی باہر پارک ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر زاہد صاح گاڑی لینے کے لیے چلے گئے تھے۔

ہوٹل میں ان کی گاڑی پارک تھی۔ میں ریاض کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ اس وقت مندوبین کی آمدورفت جاری تھی۔ ہر کوئی کانج کی طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ موسم بے انتہا خنک تھا۔ یا شاید دوبئی اور اسلام آباد کی گرمی کھا کر آئی تھی مجھے خنکی زیادہ لگ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ کئی لوگ اپنی گاڑیاں کانج کے باہر پارک کر رہے تھے۔ ایک دم سے تیز ہوائیں چلیں تو میرے جسم میں کپکپی چھانے لگی۔ میں دوبارہ کمرے میں گئی اور سویٹر پہن لی۔ اور قدرت کی اس بے نیازی پر حیران تھی۔ کہیں موسم سرد اور کہیں گرم۔ یہ سب اللہ کا کمال تھا۔ جس نے اتنی ساری کائنات کو منظم طریقے سے رکھا ہوا ہے۔ سچ ہے ہر چیز پر وہ قادر ہے۔ دور سے زاہد صاحب گاڑی کانج کی جانب لا رہے تھے۔ اور اس دیار غیر میں اس طرح کی سہولت ملنا کسی غنیمت سے کم نہیں تھی۔

جوہانسبرگ شہر میں گہما گہمی تھی۔ سڑکیں صاف شفاف اور منظم ٹریفک تھی۔ ہوٹل سے گاڑی نکل کر شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ یہاں پر رونق تھی' زندگی تھی' مختلف پارکس اور ریستوران کے علاوہ پلازے تھے۔ زاہد صاحب نے گاڑی چلاتے ہوئے ہم سے پوچھا۔

''آپ کو پلازہ میں لے جاؤں کہ ساؤتھ افریقہ کی سوغاتوں کی مارکیٹ میں؟''

پلازہ تو دیکھے ہی تھے' میں نے سوچا افریقہ کا کلچر تو اس مارکیٹ میں جا کر ہی ملے گا۔ سو مارکیٹ میں جانے کے لیے کہہ دیا۔ پانچ یا سات منٹ کی ڈرائیو پر مارکیٹ آ گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر یوں معلوم ہونے لگا جیسے افریقہ کا سارا کلچر تہذیب وتمدن یہاں پر سمٹ گیا

ہو۔افریقی طرز کے لباسوں میں سیاہ فام مرد عورتیں۔۔۔۔۔۔۔آمنے سامنے گلیوں میں دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔پاکستان کی طرح مسکراتے' بلاتے اور سمجھانے کی کوشش کرتے کہ ہماری چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔لکڑی کے کام کی بنی اشیاء ٹیبل لیمپس' کینڈل ٹیز' جنگل کے تمام جانور۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے میٹل اور زیادہ تر لکڑی میں بنائے ہوئے تھے۔چھوٹے ہاتھی اور بڑے ہاتھی' درمیانے سائز کے۔اسی طرح شیر ہر سائز کا' لکڑی کے کامدار پھول دان۔غرض کہ اس مارکیٹ میں جا کر باقی کے ملکوں کو بھول جاتے ہیں۔یہاں پر ان کی منہ بولتی روایت کی چیزیں تھیں۔لباسوں کے معاملے میں وہ آزاد تھیں' بالکل ہمارے ملک کی بنجارنوں کی طرح' کھلے گھاگھرے' اوپر بلاؤز' پاؤں میں سلیپر' سر پر چھوٹی سی ٹوپی' موٹے موٹے نین نقش' رنگت گہری سیاہی مائل۔۔۔۔۔۔۔اتنی عمدہ چیزیں دیکھ کر خیال آتا تھا کہ قدرت نے اگر حسن نہیں دیا تو سیرت حسین دی ہے۔جوہانسبرگ کے مقامات حسین اور فضا لاجواب تھی۔زندگی کے بہترین اصول اور لباس کی نفاست کم دکھائی دیتی تھی۔ان دکانوں پر بھی بھاؤ تاؤ کر سکتے تھے۔گلیوں کے درمیان ریڑھیاں لگی تھیں' جہاں پر افریقی سبز پتھروں کی اشیاء اور لکڑی کی اشیاء دکانوں کی نسبت سستی بیچ رہے تھے۔ابھی میں ان چیزوں کو دیکھ ہی تھی کہ ڈھول بجنے کی آواز دوسری گلی سے آئی۔خواہ مخواہ ہمارے قدم ادھر بڑھ گئے تھے۔

وہاں گلی میں پہنچ کر دیکھا تو چند لڑکے اور لڑکیاں افریقی لباس پہنے (بالکل جنگلی) ناچ کرنے میں مصروف تھے۔ڈھول کی تھاپ پر ان کے پاؤں تیزی سے چلتے۔ہاتھوں میں برچھیاں لیے ناچ رہے تھے۔یوں معلوم ہونے لگا جیسے جنگل سے نکل کر شہر آئے ہوں۔ہر طرح کا باشندہ اس بازار میں دکھائے دے رہا تھا۔عجیب قسم کا سماں تھا۔کئی ملکوں میں گھومی پھری ہوں مگر اس ملک کی انفرادیت الگ نوعیت کی تھی۔ان کے رہن سہن کا طرز' اٹھنے بیٹھنے اور گانے بجانے کا طور طریقہ نہایت ہی مختلف تھا۔پھر سب سے بڑی بات یہ نوٹ کی کہ وہ آزادی محسوس کر رہے تھے' کھلے ڈلے۔۔۔۔۔۔۔نہ ڈر اور نہ ہی خوف۔۔۔۔۔۔۔مزے سے ناچ رہے تھے اور لوگ وہاں جمع ہو کر ان کا ناچ دیکھ رہے تھے۔زندگی کے چلن کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ہر دیش کی اپنی باتیں اور اپنے رواج ہیں۔کوئی احساس کمتری نہیں کہ ہم خوبصورت ہیں' ہمارا رنگ سیاہی مائل ہے۔۔۔۔۔۔۔وہ خوش دکھائی دیتے تھے اور خوشی سے گا بجا رہے تھے۔

وہاں سے ہٹ کر زاہد صاحب ایک دکان پر لے گئے جہاں پر بہت ساری اشیاء لکڑی کی بنی تھیں۔یہاں پر سٹیچوز اور موم بتیوں کے واز اور پھول دان بھی رکھے ہوئے تھے۔ہر طرح کی موم بتیاں بھی کامدار تھیں۔خوشبو والی اور بغیر خوشبو کے' سادی اور پھول دار' غرض کہ ہر طرح کی موم بتی بھی دستیاب تھی جو مہنگے داموں میں مل رہی تھیں۔میں نے دکاندار سے پوچھا۔

''اتنی نفاست سے بنی ہیں۔ ہمارا ملک اتنا گرم ہے یہ پگھل جائیں گی۔''

تو اس نے جواب دیا۔ ''گرمی یہاں بھی پڑتی ہے مگر ان کو اس طریقے سے بنایا ہوا ہے کہ ہر موسم میں برقرار رہیں گی اور پگھل نہ سکیں گی۔ وہ سستا بازار تھا۔ وہاں پر لوگ بھی اتنے پوش نہیں تھے۔ ایک خاتون کی دکان میں چلی گئی تھی۔ وہ لکڑی کی کینڈل لینڈ مجھے دکھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''پسند آئی ہیں؟''

''خوبصورت ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ انگریزی میں بول چال تھی مگر انہیں انگریزی کی سمجھ دیر سے آتی تھی یا پوری سمجھ نہ پاتی تھیں۔ میں نے اسے پوچھا۔

''آپ نے اپنا گھر خوب سجایا ہوگا۔'' وہ ادھیڑ عمر کی خاتون کھلکھلا کر ہنس پڑی اور جواب دیتے ہوئے بتانے لگی۔

''سارا دن میں دکان پر ہوتی ہوں' ان چیزوں کو بیچتی ہوں اور صفائی ستھرائی کرتی ہوں۔ اگر گھر میں سجالوں تو روٹی کہاں سے کھاؤں گی۔''

میں حیران تھی گو کہ دکان بہت بڑی نہیں تھی مگر اچھی خاصی تھی اور چیزیں بھی عمدہ رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بتا رہی تھی۔

''روٹی کا مسئلہ تو چلو ایک طرف' ہر روز دکان میں یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر جی بھر جاتا ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ گھر کی سجاوٹ میں دوسرے ملک کی چیزیں ہوں مگر فرانس' اٹلی کے کرسٹل بہت مہنگے ہیں۔ میرے دو بچے سکول اور کالج میں پڑھتے ہیں ان کا خرچہ پورا کرنے کے لیے گھر کو سادہ رکھا ہوا ہے۔''

''اور شوہر۔۔۔۔۔۔۔؟''

''وہ نہیں ہے۔'' اس نے دھیرے سے بتایا۔

''کہاں ہے؟''

''چھوڑ گیا ہے۔''

''شادی کر لی اس نے؟''

''نہیں' بس ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے آئیڈیاز مختلف ہیں۔''

''بچوں کو خرچ دیتا ہے؟''

''جو دینا تھا اس نے دے دیا۔۔۔۔۔۔۔اور چلا گیا تھا۔''

''کیا دیا تھا؟'' میں نے بہت پرسنل سوال کر دیا تھا۔ وہ اپنی روداد خود بتانا چاہتی تھی' اس لیے مجھے پوچھنے میں دقت نہیں ہوئی تھی۔

''گھر اور دکان کی آدھی چیزیں۔''

''اچھا' گھر دے دیا تھا اس نے۔۔۔۔۔۔۔خود کہاں گیا؟''

''وہ نیویارک میں دکان چلا ہے۔ ساؤتھ افریقہ کی چیزیں بیچتا ہے۔''

''بچے یاد نہیں آتے اسے؟''

''اگر یاد آتے تو جاتا کیوں۔۔۔۔۔۔۔یہاں پر اسی طرح ہوتا ہے' کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا۔''

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا تو میری ہمت نہ ہوئی اس سے پوچھنے کی۔

وہ تھوڑی سی اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ ہر جگہ آدمی کی بے وفائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر اس قوم میں برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

''تم یہاں داستان سن رہی ہو' ہم باہر دکان کے انتظار کر رہے ہیں۔ لنچ کے لیے زاہد صاحب لے جانا چاہتے ہیں۔'' ریاض نے مجھ سے کہا۔

میں نے اس سے دو لکڑی کے کینڈل سٹینڈ اور موم بتیاں لیں اور خدا حافظ کہہ کر دکان سے باہر نکل آئی تھی۔ ان گلیوں کا ماحول مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے جنگل میں زندگی گزارتے ہوئے تھوڑے سے مہذب ہو گئے ہیں اور شہر میں انہوں نے بسیرا کر لیا ہو۔

اس مارکیٹ کو خیر باد کہہ کر ہم زاہد صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے تھے اور گاڑی مارکیٹ کی حدود سے نکل کر ڈاؤن ٹاؤن کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

اونچی اونچی بلڈنگیں میرے سامنے تھیں۔ یہاں پر لوگ پوش بھی دکھائی دے رہے تھے۔ بینک' دفاتر' ہسپتال اور لائبریریز کے علاوہ میوزیم بھی تھے۔ سب سے بڑی بات کہ بڑے بڑے شاپنگ مال۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے زاہد صاحب ایک بہت بڑے شاپنگ مال میں لے آئے تھے۔ گو کہ اس وقت کھانے کا وقت نہیں تھا مگر دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہوا تھا۔ ایک ایسے فوڈ ایریا کی جانب بڑھے جہاں پر ہر چیز کچی سٹالوں کے اوپر لگی ہوئی تھی۔ مچھلی' بیف' چکن اور سبزیاں۔۔۔۔۔۔۔غرض کہ جو کچھ بھی کھانا چاہو تو وہ سامنے بناتے تھے۔ یہاں اس ماحول میں آ کر دنیا کا پتہ چل رہا تھا کہ

اس قوم نے کتنی ترقی کی ہے۔ان کا شاپنگ مال کسی لحاظ سے لندن' امریکہ اور کینیڈا سے کم نہیں تھا اور چیزیں ان تمام ممالک کی مل رہی تھیں اور خاص کر ساؤتھ افریقہ کی چیزیں بیچنے کے لیے رکھی تھیں۔مال صاف ستھرا ہر آلودگی سے پاک تھا۔چیزوں کے لحاظ سے اور کھانے کے لحاظ سے لگتا تھا' افریقہ نے بہت ترقی کی ہے۔

اس ریستوران میں بیٹھے ہوئے مچھلی کا آرڈر دیا تھا۔تقریباً بیس منٹ یا آدھے گھنٹے کے بعد مچھلی کڑائی میں بنی ہوئی میز پر رکھی جا چکی تھی۔سب کو بھوک لگی تھی۔بڑی رغبت سے کھائی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم مال میں گھومنے لگے۔ایکسی لیٹر اوپر جانے اور نیچے آنے کے لیے لگے تھے۔لفٹوں کا الگ انتظام تھا۔غرض کہ یہاں پر لوگ ہر رنگ اور نسل کے دکھائی دے رہے تھے۔خواتین بچوں کے ساتھ آئی ہوئی شاپنگ کر رہی تھیں۔افریقی لڑکیوں نے یہاں پر پینٹس پہنی ہوئی تھیں' اوپر بلاؤز چھوٹے چھوٹے۔۔۔۔۔۔۔ان کا سیاہ رنگ نمایاں ہو رہا تھا۔فیشن ایبل لڑکیاں ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک لگائے ہوئے تھیں۔

یہاں پر زندگی حسین اور رنگین تھی۔میں مارکیٹ اور پلازہ کا موازنہ کرنے لگی تھی۔وہاں پر تو لوگ ابھی تک بیک ورڈز دکھائی دیتے تھے۔مگر افریقہ نے ترقی کرتے ہوئے نہ صرف عمدہ مقامات بنائے بلکہ اپنی قوم کو مہذب اور ماڈرن بھی بنا دیا تھا۔اس مال میں یورپین لڑکیاں بھی کہیں کہیں دکانوں پر دکھائی دیتی تھیں۔یعنی دس افریقی لڑکیوں کے ساتھ دو گوری لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔جوہانسبرگ میں خوب صورت پارک' میوزیم کے علاوہ سن سٹی جو کہ آرٹیفیشل چھوٹا سا ٹاؤن افریقیوں کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا۔ہر چیز اس میں خود بنائی ہوئی تھی۔کافی لوگ اس مال میں تعریف کر رہے تھے کہ Sun City ضرور دیکھیں۔

مال کے نیچے آبشار مصنوعی بنی ہوئی تھی۔فوارہ۔۔۔۔۔۔ایک تالاب کے درمیان چل رہا تھا اور دیوار پر آبشار بہتی ہوئی اس تالاب میں گر رہی تھی۔وہاں ماربل کے بنچ بیٹھنے کے لیے بنے تھے۔یہ آبشار تین دروازوں کے درمیان تھی۔جو باہر ڈرائیو وے پر جاتی تھی۔باہر بہت سی گاڑیاں پارک ہوئی تھیں۔یہاں ساؤتھ افریقہ میں اپنی ہی دنیا آباد تھی۔یہاں پر بھی کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں تھا' اپنی اپنی دھن میں شاپنگ کر رہے تھے۔

وہاں سے دوسری سمت بڑھی تو ایک اور فوڈ ایریا آ گیا تھا۔تقریباً ہر ملک کا اپنا ہی کھانے پینے کا سلسلہ ہے مگر۔۔۔۔۔۔دنیا کا نقشہ ایک سا ہے۔ہر ملک کی طرح یہاں پر بھی ہر کھانے کے سٹال لگے تھے۔چائنیز' پاکستانی' انڈین' سینڈوچ برگر اور جاپانی کھانا۔اس ایریا کے دوسری جانب جوتوں کی دکانیں تھیں۔اور کچھ جوتوں کی دکانیں اوپر تھیں۔ہر جگہ' ہر دکان اور مختلف جگہوں پر عورتوں کا

راج تھا۔

خواتین سیل گرل تھیں' خواتین کیمرہ ویڈیو شاپ اور ملبوسات سوتی' اونی اور گرم ہر جگہ' کہیں کہیں کوئی مرد نظر آتا تھا' مگر تقریباً سیاہ فام خواتین جو نہ تو بدمزاج اور نہ ہی خوش مزاج تھیں۔ ہندو لڑکیاں بھی بہت سی جگہ دیکھنے کو ملتی تھیں۔

میں اس مال میں تالاب اور آبشار کے پاس چلی گئی تھی وہاں پر چند فیملیز ان سنگ مرمر کے بنچوں پر بیٹھی ہوئی اپنے بچوں کو کچھ نہ کچھ کھلا رہی تھیں۔ ایک عربی خاتون بایہ پہنے ہوئے اپنے ننھے سے بچے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ فیڈر بچے کے منہ پر لگایا ہوا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر مسکرائی اور مجھے بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔

''کتنے مہینے کا ہے؟''

''دو ماہ کا'' اس نے اردو میں جواب دیا تو میں حیران ہو گئی تھی۔

''آپ کو اردو آتی ہے؟''

''میرے میاں نے سکھا دی ہے۔''

''کیا وہ پاکستانی ہے؟''

''جی۔۔۔۔۔۔۔ بہت سالوں سے وہ ادھر سیٹل تھا۔''

''تو کیا آپ پاکستانی لوگوں سے شادیاں کر لیتے ہیں؟''

''جی۔۔۔۔۔۔۔ اسلام میں ہر مسلمان کے ساتھ شادی جائز ہے۔ شوہر میرے باپ کے سٹور میں کام کرتا تھا' تو باپ کو اچھا لگا اور شادی کر دی۔'' وہ معصومیت سے جواب دیتے ہوئے بتانے لگی۔

''آپ خوش ہیں؟''

''بہت۔۔۔۔۔۔۔ کم از کم بہت شادیاں تو نہیں کرے گا۔'' اس کی اس بات سے میں مسکرا پڑی۔ دور سے اپنے میاں کو آتے دیکھا تو اس سے اجازت لے کر کہا۔

''پاکستان اچھے شوہر ہوتے ہیں' تم خوش رہو گی۔''

''اللہ کرے۔۔۔۔۔۔۔ ابھی تو نئی نئی بات ہے۔''

''فکر کی بات نہیں' اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

یہ کہتے ہوئے ہم مال سے باہر ڈرائیوے پر پہنچ گئے۔

جنوبی افریقہ' افریقی براعظم کے جنوبی کونے پر واقع ہے۔ جنوبی افریقہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ اس کے معدنی ذخائر دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان کی معدنیات میں سونا' کوئلہ' ہیرے' پلاٹینم' لوہا' تانبا اور قدرتی مناظر کی بنا پر جنوبی افریقہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ افریقہ کے گھنے جنگلات اور جنگلی جانوروں میں تاریخی پس منظر یہ ہے کہ یہاں مختلف افریقی قبائل آباد تھے۔ ان قبائل کی اپنی اپنی ثقافت تھی۔ اپنے عادات اور اقتدار اور ان قبائل کا اپنا قدرتی ماحول سے گہرا تعلق تھا۔ اور یہ اپنے ماحول سے جڑ کر زندگی بسر کرتے تھے۔

Colonial سامراج کے تحت سب سے پہلے ہالینڈ نے جنوبی افریقہ کے مختلف حصوں پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے جنوبی افریقہ کے ایک حصے Cape of Good Hope پر قبضہ جمایا۔ اس وقت جب ہیرے اور سونا دریافت ہوا تو زیادہ سے زیادہ لوگ باہر سے آنے لگے۔ پھر ۱۸۹۹ء سے لے کر ۱۹۰۲ء تک ہالینڈ کے باشندوں اور انگریزوں کے درمیان برتری حاصل کرنے کے لیے جنگ ہوئی۔ آخر کار انگریزوں کی جیت ہوئی اور اس کے بعد جنوبی افریقہ کو ''یونین آف ساؤتھ افریقہ'' کا نام دیا گیا اور وہاں ایک بہت ہی ظالمانہ اور Unjust حکومت کا قیام ہوا۔ اس کے زیر سفید فام باشندوں اور وہاں کے اصلی کالے باشندوں کے لیے دو الگ الگ پالیسیاں (Policies) رکھی گئیں اور کالوں کو ان کے حقوق دیئے۔ سیاہ فام لوگ یہاں کے اصل باشندے بھی تھے اور اکثریت بھی تھی اور ان کی نسبت سفید فام تھوڑے تھے۔ جنوبی افریقہ کے سیاہ فام نے جدوجہد جاری رکھی اور آخر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں نیلسن منڈیلا کی قیادت میں آزادی پائی۔ کالوں اور سفید فام لوگوں کے لیے مختلف پالیسی کا خاتمہ ہوا اور جمہوری پرنسپل کی بنیاد پر حکومت کا قیام ہوا۔ آج ہم اسی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ کے ہوٹل میں آئے ہوئے تھے۔ ریاض تو کانفرنس اٹینڈ کرنے چلے گئے اور مجھے ایمبیسڈر صاحب کی اہلیہ کا انتظار تھا۔ انہوں نے مجھے ملنے کے لیے آنا تھا۔ میں ڈائننگ روم میں ناشتہ کر رہی تھی۔ یہ شہر خاموش سا لگا تھا۔ یہاں پر بہت سارے سیاح بیٹھے ہوئے تھے ناشتہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سیاہ فام ویٹرس پھرتی سے گھوم رہی تھیں۔ مجھے اکیلے دیکھ کر اس نے ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں بیٹھ جاؤ۔ شیشوں کے دروازوں سے باہر تالاب کا منظر آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ فوارہ چل رہا تھا اور اس کا پانی حسب معمول تالاب میں گر رہا تھا۔ میں ناشتہ کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے جلدی بھی تھی کیونکہ ایمبیسڈر کی اہلیہ کو میں نے نہیں دیکھا تھا سو ناشتہ کے بعد لاؤنج میں بیٹھ گئی تھی۔ اور لوگوں کی سرگرمیاں دیکھنے لگی

تھی۔ انتظار تھا۔ میں نے اپنی نوٹ بک نکالی اور نوٹس بنانے لگی۔ ہوٹل Kopanong میں اس وقت رونق تھی۔ میں کانفرنس ہال میں چلی گئی جہاں پر دنیا جہان سے آئے ہوئے ججز اپنا اپنا نظریہ بیان کر رہے تھے۔ ہال کے چاروں کونوں پر ڈیسک تھے اور مائیک ان کے سامنے تھا۔ یہ میزیں قطار کی صورت میں آمنے سامنے تھیں۔ ہال کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کیبن جہاں ترجمہ کرنے والے بیٹھے مختلف زبانوں میں ترجمہ کر رہے تھے اور ان کیبن کے پاس بہت ساری نشستوں پر لائیٹر اور لیکچرار بیٹھے ان کا تبادلہ خیالات بڑی خاموشی اور تحمل کے ساتھ سننے میں محو تھے۔ دوسری جانب کافی جرنلسٹ بیٹھے ہوئے کانفرنس کی کارروائی کے بارے میں رپورٹ تیار کر رہے تھے۔ مووی کیمرہ سے فلم بن رہی تھی۔ بہت سی تصویریں کھینچی جا رہی تھیں۔ میں وہاں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک دم خیال آیا کہیں وہ آ نہ گئی ہوں سولاؤنج کی جانب پہنچی ہی تھی کہ دور سے میں نے شلوار قمیض میں ایک خاتون کو دیکھا' جو میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہی ایمبیسڈر صاحب کی اہلیہ ہیں۔ وہ قریب آ کر مجھ سے علیک سلیک کرنے لگیں۔ ''آپ مسز ریاض ہیں؟''

میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''جی'' میں نے مسکراتے ہوئے ان کے سلام کا جواب دیا اور میرے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ہم آپس میں گفتگو کرنے لگیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ میں پہلے کالج کی جانب گئی تھی آپ کو ڈھونڈنے کے لیے' جب آپ کو وہاں موجود نہ پایا تو لاؤنج میں دیکھنے کے لیے آ گئی۔

''میں دراصل کانفرنس ہال میں چلی گئی تھی۔ مجھے آپ کا انتظار بھی تھا۔''

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک پرکشش چہرہ میرے سامنے تھا۔

''آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟''

''مجھے تو یہاں کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ جہاں لے جائیں گی' چپ چاپ چلی جاؤں گی۔''

''اچھا'' وہ مسکرائیں۔ ''ایک تو شاپنگ سنٹر ہے اگر آپ کو شاپنگ سے دلچسپی ہے تو وہاں چلتے ہیں اگر نہیں تو یہاں سے سن سٹی ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہے ان لوگوں نے خود بنایا ہے اگر وہاں کہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''کیا واقعی ہی بہت خوبصورت ہے۔ تعریف تو بہت سنی ہے۔''

''جی بہت خوبصورت ہے وہاں ۔۔۔۔۔۔۔ بیچ ۔۔۔۔۔۔۔ ہوٹل سب آرٹی فیشل بنائے ہوئے ہیں۔ انسان ان چیزوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔''

ان کا نام آسیہ تھا۔ میں نے جواب دیا۔

''سن سٹی چلتے ہیں۔ چیزیں تو ہر جگہ دستیاب ہوتی ہیں۔ دور دیش میں روز تھوڑی آیا جاتا ہے۔ مگر مقامات کا اپنا ہی چارم ہوتا ہے۔ سویٹ میمری میں شامل ہو جاتے ہیں۔''

''آپ نے بالکل بجا کہا ہے۔ چلیں۔۔۔۔۔۔۔ آپ Sun City جا کر واقعی ہی بہت خوش ہوں گی۔''

سو میں آسیہ کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راستے میں پوچھا کہ کتنے منٹ کی ڈرائیو ہے تو اس نے جواب دیا۔ یہاں سے گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ ضرور لگتا ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے بڑی مہذب' ملنسار لگی۔ جب کچھ پوچھتی تو بڑی خوش دلی سے جواب دیتی۔

گاڑی جوہانسبرگ کے ڈاؤن ٹاؤن سے گزرنے لگی۔ افریقہ کے بارے میں سنا ہوا تھا کہ بہت خوبصورت ہے۔ مگر میں دو دن کی جوہانسبرگ آئی ہوئی تھی۔ مجھے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اتنا خوبصورت نہیں لگا تھا۔ شاید خوب صورت ہو مگر میری آنکھوں میں اس کی خوبصورتی جچی نہیں تھی۔ ڈاؤن ٹاؤن ہوٹل کے ایریا سے نکل کر کچھ بہتر لگا۔ یہاں پر ہلکی پھلکی گہما گہمی تھی۔ پلازہ۔۔۔۔۔۔ سینما۔۔۔۔۔۔۔ دفاتر۔۔۔۔۔۔۔ دکانیں۔۔۔۔۔۔ غرض کہ ہر شے کی دکان گزرتی ہوئی گاڑی سے دکھائی دینے لگی۔ فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی خواتین گہرے سانولے رنگوں کی تھیں۔ لباس بھی کوئی اتنے پرکشش نہیں پہنے ہوئے تھے۔ اسی طرح مرد بھی۔ اسی طرح کی رنگت اور موٹے تازے تندرست دکھائی دے رہے تھے۔ پھر گاڑی نے موڑ کاٹا اور دوسری سمت چلنے لگے۔ یہ سڑک سن سٹی کو جاتی تھی۔ ہموار سڑک پر بڑی ہی کم ٹریفک تھی۔ درخت سوکھے۔۔۔۔۔۔۔ سرخی مائل زمین کی مٹی تھی۔ گھاس زیادہ تر سوکھا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سبز گھاس بھی دکھائی دیتا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔ آسیہ کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''کتنے بچے ہیں؟''

''دو بیٹے ہیں' زیر تعلیم ہیں۔''

''کتنا عرصہ ہوا ہے یہاں آئے ہوئے؟''

''ایک سال ہو گیا ہے۔ دو سال کا اور کنٹریکٹ ہے۔ اس سے پہلے تین سال یورپ کے علاقے میں رہے ہیں۔ وہ بڑی سوفٹ سپوکن تھیں' دھیمی گفتگو کرنے والی اور میرے بارے میں پوچھنے لگی۔

میں نے بھی اسے بتا دیا کہ تین بچے ہیں۔ ایک پاکستان میں اور دونوں بیٹیاں امریکہ میں۔ جب میں نے بتایا کہ ہم لاہور کے ہیں تو وہ بہت محظوظ ہوئی اور بتانے لگی' میں لاہور کی ہوں اور میرے میاں بہاولپور کے۔

آسیہ کو میں نے بتایا کہ بہاولپور میں دو سال رہی ہوں۔ اور میری نظریں دائیں بائیں ہائی وے پر گھومنے لگیں۔ کم آبادی ہونے کی صورت میں خال خال گھر دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں کاٹیجز نما گھر تھے لیکن یورپ اور امریکہ کی طرح ایک ڈیزائن کے نہیں تھے۔ کہیں کہیں فرق نمونوں کے گھر بھی نظر آتے۔

راستے میں لہلہاتے کھیت جو سرسبز بھی تھے۔ وہاں پر چاولوں کی کاشت کی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر درخت تیزی کے ساتھ ہمارے ہمراہ جا رہے تھے۔

آدھا گھنٹہ جب گزر گیا تو ایک جگہ ایسی آئی جہاں پر چھوٹی پہاڑی پر خوبصورت گھر بنے ہوئے تھے اور گھروں کے اوپر پہاڑ تھے۔ یہاں پر ہریالی تھی۔ ایبٹ آباد کی طرح اس کا نمونہ تھا۔ اور یورپ کے شہر اوسلو سے بھی ملتا جلتا تھا۔ پھر وہ گھر اور پہاڑ بھی پیچھے رہ گئے۔ دور میدانی علاقے میں ہرن اور کئی قسم کے جانور بھاگتے ہوئے گزر جاتے۔ اچھلتے کودتے جانور بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پیچھے نگران بھی تھا۔ یہ کہ نہیں سڑک پر بے دھڑک آ جائیں۔ اور چلتی ہوئی گاڑیوں کو بریک لگانی پڑے یا جانوروں کا بچاؤ کرتے کرتے وہ خود ایکسیڈنٹ کروا بیٹھیں۔ پھر ایک ایسی جگہ دیکھنے کو ملی جہاں غریب لوگوں کی ڈبیا کی صورت میں جھونپڑیاں تھیں۔ نیلی' پیلی' ہری اور کئی دوسرے رنگوں میں ۔۔۔۔۔۔۔ باہر تار پر ان کے بچوں کے دھلے کپڑے لٹکے دکھائی دے رہے تھے۔ افریقہ میں بھی غربت ہے وہاں بھی غریب لوگ بستے ہیں مگر ان کی کاٹیجز چھوٹی ضرور تھیں مگر ٹوٹی پھوٹی نہیں تھیں جیسے کہ سہون شریف جاتے ہوئے میں نے پاکستان میں دیکھی تھیں۔ تنکوں سے بنی' وہ بھی مکمل نہیں تھیں۔ خستہ حالت کی جھونپڑیاں دیکھ کر مجھے ترس آیا تھا۔ ایک جھونپڑی میں نہ جانے کتنے کتنے لوگ رہتے ہوں گے۔ غرض کہ غربا کی جھونپڑیاں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد ایک پل آیا اور دونوں سائیڈ سے دریا بہہ رہا تھا۔ اس کو عبور کرنے کے بعد Pretaria کا علاقہ آ گیا تھا۔ پرٹیریا یونیورسٹی میں پورا شہر بنا ہوا ہے اس کے ڈاؤن ٹاؤن سے گاڑی گزری تو اس ڈاؤن ٹاؤن کو خوبصورت پایا۔ وہاں پر بھی بینک' مال' شاپنگ پلازہ' سینما' خوبصورت پارک جہاں پر ہر قسم کے لوگ بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں پر بھی بہت زیادہ رش نہیں تھا۔ شاید یہاں کی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ایک چیز سے میں بہت متاثر تھی کہ شہر انتہائی صاف ستھرا تھا کسی قسم کی آلودگی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہاں سے سن سٹی کا راستہ ابھی ابھی آدھے گھنٹے سے کم نہیں تھے۔ لیکن سڑک اچھی ہونے کی صورت میں تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جہاں بھی' جس ملک میں بھی جائیں وہاں پر سڑکیں لاجواب ملتی ہیں۔ گھنٹوں موٹر پر بیٹھیں رہیں تو آپ کو تھکن محسوس نہیں ہو گی۔ اسی طرح کئی کئی گھنٹے سیاح مختلف مقامات کی دن بھر سیر کرتے رہتے ہیں' تھکتے نہیں۔ سیاحت کا انہیں شوق ہوتا ہے۔

گھر سے مختصر سا سامان ایک بیگ میں ڈالتے ہیں اور اللہ کا نام لے کر نکل پڑتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ صندوق بھر بھر کپڑوں کے لے جاتے ہیں۔ ہر مرتبہ دشواری ہوتی ہے مگر یہی کہتے ہیں کہ اگلی مرتبہ بہت سامان ساتھ نہیں رکھیں گے' جاتے وقت بہت سا سامان اکٹھا ہو جاتا ہے۔ انہی سوچوں میں گم تھی کہ سن سٹی کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ ایسا علاقہ یا شہر تھا جو پورے کا پورا ان لوگوں نے خود بنایا ہوا تھا۔ ایک بل کھاتی سڑک چکر کاٹنے لگی اور مصنوعی پہاڑوں کے گرد گھومتی گھوماتی ہوئی ایک پیلس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہاں پر ایک بس سے ٹورسٹ نکل رہے تھے۔ ہاتھوں میں ان کے کیمرے تھے۔

میں نے اچٹتی سی نظر ڈالی تو یہ محل نہیں بلکہ ایک ہوٹل تھا جس کا سارا نمونہ محل جیسا تھا۔ باہر سے محل کی بالکونیاں خوبصورت نقش و نگار کی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں پر ایک رات کا پانچ ہزار Rand کرایہ تھا۔ اکثر نئی نویلی دلہن اور دولہا یہاں پر ٹھہرتے' رات بسر کرتے تھے۔ اور دوسرے دن یا اگلے دن روانہ ہو جاتے تھے۔

میں نے آسیہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اتنا زیادہ کرایہ؟''

''آپ اسے اندر سے تو دیکھیں' کرایہ کیوں زیادہ ہے۔''

''دوسری جانب گولف کلب تھا۔'' اس نے کہا۔

''کیوں نہ پہلے گولف کلب دیکھا جائے' محل تسلی کے ساتھ دیکھوں گی۔''

''ضرور''

ہم لوگ گولف کلب کی لابی میں داخل ہوئے تو ایک بہت بڑا مگر مچھ (کروکوڈائل) میٹل کا بنا سٹیچوز سنٹر میں بنا تھا۔ یعنی بہت بڑے مگر مچھ کا۔ اس کے بائیں جانب ریستوران تھا جہاں پر لوگ کھا پی رہے تھے۔ اس کے عین سامنے گولف کھیلنے کے لیے چاروں طرف جو جگہ بنی تھی وہ پہاڑی کی صورت میں تھی اور اس کے درمیان تالاب تھا۔ سامنے دیوار پر آبشار بہہ رہی تھی اور اس آبشار کا پانی تالاب میں گر رہا تھا۔

آبشار کے دائیں اور بائیں چٹانوں کے سیٹ لگے تھے۔ لوگ گولف کھیل رہے تھے' کچھ کھا پی رہے تھے۔ اور کچھ میری طرح صرف اس خوبصوت مقام کو دیکھ رہے تھے۔ ہر جگہ کا اپنا ہی چارم ہوتا ہے۔ اگر بتایا نہ جاتا کہ یہ گولف کلب ہے تو میں نے اسے ایک خوبصورت سیر گاہ سمجھنا تھا۔ ٹورسٹ یہاں پر بھی پہنچ کر اپنے کیمروں میں اس منظر کو بند کر رہے تھے۔ وہاں پر کوئی کسی کی پرواہ نہیں

کرتا' ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مگن ہوتا ہے۔ ہم نے بھی وہاں پر تصویریں بنوائیں اور دوسری جانب بڑھ گئے۔ چلتے چلتے محل کی طرف بڑھے۔ یہاں پر بھی کافی لوگ پہلے سے ہی موجود تھے۔ ہر کوئی باہر خوشی خوشی سے نکل رہا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ محل خوب صورت ہے۔

یہاں اندر داخل ہو کر بہت بڑی لابی میں آئی تو ماربل کے چمکتے ہوئے فرش پر دیوار پر بڑے بڑے آئینے خوبصورت پلانٹ سے آراستہ لابی' اس کی چھت اتنی اونچی' خوبصورت نقش ونگار سے منقش تھی۔

پھر ایک ایسی کوریڈور جو کہ دونوں طرف سے مصنوعی چٹانوں کی بنی۔۔۔۔۔۔۔۔وہ بل کھاتی ہوئی دیمیں جانب کو مڑ گئیں۔ باہر آ کر دیکھا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ یہاں پر چاروں طرف چٹانیں اور ان کے اندر آبشاریں بہتی ہوئی نیچے تالاب کی جانب گر رہی تھیں۔ یہ آبشاریں اور تالاب بھی مصنوعی تھے۔

وہاں بالکونی سے نیچے جھانکا تو ڈائننگ روم جہاں پر بہت ساری چیزیں لگی تھیں۔ اس ڈائننگ ایریا میں شیشوں کے دروازوں سے باہر آبشار اور چٹانوں کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ خوبصورت فرنیچر جن پر جانوروں کی کھالوں سے پوشش ہوئی تھی' ایک ایسا مقام تھا جو حیرت زدہ کرنے میں معاون تھا۔ وہاں سے نکل کر لفٹ کی جانب بڑھی تو لفٹ کا کامدار میٹل کا دروازہ تھا جس کے ذریعے محل نما ہوٹل کے ٹاپ فلور پر پہنچ کر نیچے کا نظارہ لیا تو وہ ایک مصنوعی جنت سے کم نہیں تھا۔ چاروں طرف چٹانیں' ان کے بیچ میں بہتی ہوئی آبشاریں' خوبصورت پھولوں کے پودے۔۔۔۔۔۔۔اور ان کی گھاس خزاں ہونے کے باوجود بہت سرسبز تھی۔ بہت اچھا نظارہ تھا۔ پھر بالکل فائیو سٹار ہوٹلوں کی طرح راہداریاں تھیں' جہاں پر دائیں بائیں کمرے ہی کمرے تھے۔ یہ خاص خاص لوگوں کے لیے مخصوص تھے۔ عام غریب لوگوں کی رسائی نہیں تھی۔ وہاں سے ہٹ کر درمیانی منزل پر آئے تو ایک اوپن راہداری کے دونوں جانب بڑے بڑے ہاتھیوں کے سٹیچوز بنے تھے۔ یہ سٹیچوز لاتعداد تھے۔ یہاں پر ٹھیک چار بجے مصنوعی زلزلہ کا منظر پیش کیا جانے والا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایک منٹ کم چار بجے تھے۔ میں اور آسیہ وہاں ٹھہر گئیں اور ٹھیک چار بجے وہاں پر گڑگڑاہٹ۔۔۔۔۔۔۔اور سامنے چٹان پر آگ اور لاوا پھٹتے دکھائی دیا۔ دھواں چاروں طرف بکھر گیا اور چند لمحوں کے لیے خوف سرایت کر گیا۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ سب کچھ مصنوعی ہے۔

وہاں سے ہٹ کر ایک ایسی راہداری پر پہنچی جس کی چھت شیشے کی تھی اور آسمان بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔ ہر چیز حیرت گم کرنے والی تھی۔

یہاں سے نکل کر مصنوعی بیچ پر پہنچ گئی۔ وہاں پر سمندر' ریت اور چٹانوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لوگ بیچ پر ستا رہے تھے اور سمندر کے سامنے چٹانوں کا سیٹ لگا ہوا تھا اور سمندر کے عین درمیان بھی چٹانیں تھیں۔ اور سمندر کی لہروں کو بجلی کے ذریعے آتے اور جاتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ بجلی کا سارا نظام چٹانوں کے پیچھے تھا اس لیے وہ اصلی لہریں آتی اور جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگ تیر رہے تھے' مرد عورتیں ایک ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔ اور بیچ پر بھی مرد عورتیں' ریت پر لیٹے ستا رہے تھے۔ یہ وہاں کا کلچر تھا۔ آزاد ملک' آزاد قدریں تھیں۔ یہاں پر ہر طرح کے لوگ دکھائی دے رہے تھے' سانولے گورے ۔۔۔۔۔۔۔ غرض کہ ہر ملک باشندہ' اپنی اپنی دھن میں مست تھا۔ مصنوعی جھیل کے علاوہ محل کے بارے میں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ کسی زمانے میں ایشیا کی تہذیب کا ایک بہترین محل تھا جس کو سن سٹی کے علاوہ Lost سٹی بھی کہا جاتا تھا مگر زلزلے کی وجہ سے یہ محل تباہ ہو گیا تھا لیکن اس دور میں جب دریافت ہوا تو اسے ہوٹل کی شکل دے دی گئی۔ پرانے زمانے کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے۔

اس میں ۳۳۸ کمرے اور سویٹ بنائے گئے۔ حکومت کی مہربانی سے اور بہت سی بارز (Bars) اور ریستوران بنے۔ کرسٹل کورٹ بہت ہی خوبصورت ہے جہاں شیشوں کے ذریعے باہر کا نظارہ لیتے ہوئے ناشتہ کر سکتے ہیں۔ تمام کمروں سے نظارہ دیدنی ہے' جہاں سے مصنوعی جھیل صاف دکھائی دیتی ہے اور گولف کورس بھی۔

اس کے علاوہ قدرتی مناظر خوبصورت پرنالے اور مچھلیاں جھیل میں تیرتی دکھائی دیتی ہیں' جو کہ ایک پہاڑی کے اوپر آبشار نیچے جھیل پر امڈتی ہوئی بھلی لگتی ہے۔ پھر خوبصورت باغ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جہاں طرح طرح کے پرندے اور جانور دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ آرٹ تھیٹر اور بہت ساری دکانیں نظر آئیں گی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی پوش شاپنگ سنٹر میں آ گئے ہوں۔ دنیا کی ہر چیز دستیاب تھی مگر ان کی قیمتیں بھی ہوٹل کے کرائے کے مطابق بازار سے دس گنا زیادہ تھیں۔ فرض کریں دنیا کا سب سے بڑا کسینو (Casina) ہے جہاں لاتعداد سلوٹ مشینیں ہیں۔ لوگوں کو Entertain کرنے کے لیے ساؤتھ افریقن بیف پر مبنی کھانے' بوفے کی شکل میں پام ٹیرس پر دستیاب نظر آتے ہیں۔ دنیا کی ہر ڈش وہاں بن رہی تھی' کھانوں کا شمار نہیں تھا۔ بڑوں کی دلچسپی کے علاوہ بچوں کی تفریح کے لیے بہت سامان مہیا تھا۔ فاسٹ فوڈ اور مشینوں پر کھیل کا بندوبست تھا۔ پرانا سینما بھی تھا جہاں فیملی کے ساتھ فلم دیکھ سکتے تھے۔ سن سٹی میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تھوڑے سے سستے ہوٹل بھی تھے جہاں پر کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ وہ ہوٹل بھی کم خوبصورت نہیں تھے۔ وہاں پر بھی کسینو' بچوں کے کھیلنے کے لیے پلے لینڈ اور ریستوران تھے۔ میں نے اور آسیہ نے وہاں پر کھانا کھایا۔

سن سٹی میں مختلف باغ ہیں۔۔۔۔۔۔۔Botanical گارڈنز جہاں پر ٹور دیا جاتا ہے اور گارڈن کے اندر مختلف جانوروں کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ بچوں کے لیے بہترین تفریح کا سامان ہے جہاں شیر، ہاتھی اور مختلف جانور ٹور کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ غرض کہ سن سٹی Lost سٹی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ میں پھر کہوں گی، جس کو بار بار کہنا پڑتا ہے۔

جوہانسبرگ Johanes Burg کی خوبصورت سن سٹی سے ہے، جو ہر ایک شخص کو اپنی خوبصورتی کے جال میں پھانس لیتی ہے۔ کیونکہ جب سے میں جوہانسبرگ آئی تھی ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ آپ نے سن سٹی دیکھا کہ نہیں۔ اگر کہا جائے ''نہیں'' تو کہا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔''پلیز آپ آئے ہیں تو ضرور دیکھئے گا۔''

سارا دن ہمارا وہاں گھومنے میں ہی لگ گیا تھا۔ اب خیال پیدا ہونے لگا کہ ہوٹل واپس جایا جائے کیونکہ کانفرنس کے مندوبین کے لیے رات کو عشائیہ دیا جا رہا تھا اور ساتھ ہی میوزک کا پروگرام تھا۔ تھک ہار کر ہم نے واپسی کا سوچا۔

گاڑی ایک بار انہی راستوں سے گزرنے لگی تھی۔ شام کے دھندلکے گہرے ہونے لگے تھے۔ وہی پہاڑ جو آتے ہوئے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے وہ سیاہی مائل نظر آنے لگے تھے۔ ٹریفک کچھ اور بھی کم ہو گئی تھی۔ خاموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ راستہ لمبا تھا۔ آسیہ نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں اور میں گہری شام کا منظر آنکھوں میں سمو رہی تھی۔ آسیہ نے مجھے ہوٹل میں چھوڑنے کے بعد اپنے گھر جانا تھا۔ ابھی تو ہوٹل کا راستہ ایک گھنٹے کا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے بعد آدھا گھنٹہ اپنے گھر جانے کے لیے درکار تھا۔ بڑی حوصلہ مند خاتون تھی۔ بڑی خوش دلی سے سیر کرواتی رہی ورنہ ایک گھنٹہ مال میں شاپنگ کروا کر گھر جا سکتی تھی مگر شاید وہ چاہتی تھی کہ میں وہاں کا خوبصورت شہر دیکھ لوں۔ سو آسیہ کی مہربانی سے اللہ کی رضا سے میں نے وہ مقام دیکھ لیا تھا۔

جب میں کاٹج کی طرف جا رہی تھی تو وہاں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا ہونے کی صورت میں راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر آہستہ آہستہ فوارہ چلنے کی مدھم سی موسیقی میرے کانوں میں گونجی۔ تالاب سے تھوڑی دور کاٹیج تھی۔ ایک جیسے چھوٹے چھوٹے کاٹیج تھے۔ اندھیرے میں تو بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے، مگر ہر کاٹیج کے باہر مدھم سی روشنی تھی۔ وہاں کا ماحول اور فضا اس وقت پر اسرار سی لگ رہی تھی۔ لیکن جلد ہی مجھے اپنی کاٹیج کا نمبر لکھا نظر آیا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ کمرہ کھولا اور میں کاٹیج میں داخل ہو گئی۔ ریاض ابھی تک کانفرنس کے مندوبین کے ساتھ ہوٹل میں ہی تھے۔

اندر داخل ہو کر میں نے ہیٹر کو آن کر دیا تھا۔ کیونکہ کمرہ کافی سرد تھا۔ اس وقت کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کی جانب دیکھا تو خاصا اندھیرا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی دور دور تک پھیلی تھی، جو برائے نام تھی۔

میں اپنا لباس صبح کو ہی استری کر چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد عشائیہ پر جانا تھا۔ مگر ریاض ابھی تک نہیں آئے تھے۔ شاید ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جلدی سے تیار ہونے لگی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہاں کتنی خاموشی ہے' کوئی رونق نہیں۔ دروازہ آہستہ سے کھٹکا تو میں نے ایک دم سے دروازہ کھولا۔ شاید ریاض آ گئے ہیں مگر ایک دم سے نیگرس اندر داخل ہوئی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سیاہ فام خاتون میرے سامنے تھی۔

''میڈم! آپ کے فون کا ریسیور کریڈل پر نہیں رکھا ہے۔ لاؤنج میں آپ کے شوہر بیٹھے فون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں' مگر بہت دیر سے فون انگیج جا رہا تھا۔ ڈنر کا ٹائم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔چلیں!''

میں تیار تھی۔ اپنے حواسوں کو قابو میں رکھتے ہوئے اس کے ہمراہ چل پڑی۔

رات ہو چکی تھی۔ میں تیار ہو کر کاٹج سے لابی تک آئی تو میرے میاں میرا انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ مندوبین دور دراز سے آئے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ اس کی اہلیہ تھی۔ اپنے اپنے ملک کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ جج صاحبان اور وکلاء بھی تیار ہو کر ان کو اپنے ہمراہ لا رہے تھے۔ اس وقت اس لابی میں خوب گہما گہمی دکھائی دے رہی تھی۔ دنیا بھر کے چیف جسٹس اور جج صاحبان جو سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے تھے' ان کے علاوہ وکلاء بھی تمام دنیا سے چیدہ چیدہ اکٹھے ہوئے تھے۔

ڈائننگ ہال کے باہر بڑے سے ہال میں میزوں پر ہر قسم کا مشروب رکھا تھا۔ مرد عورتیں سبھی پینے پلانے میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ افریقین لڑکیاں پتلی' موٹی اور بے انتہا موٹی سفید لہنگوں اور سفید چھوٹے کرتوں میں جن کے اوپر کالی مغزیاں لگی تھیں' سانولے رنگوں کیں۔۔۔۔۔۔۔سفید لباس میں اور بھی گہرے سانولے رنگ کی دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے ایک جیسا لباس پہنا ہوا تھا اور ایک لڑکی درمیان میں' باقی اس کے پیچھے لائن کی صورت میں افریقی گانا گاتے ہوئے ناچ رہی تھیں۔ تمام مندوبین مرد عورتیں ان کا گانا اور ناچ دیکھ رہے تھے۔ میرے قریب ہی ایک خاتون عربی میں اپنی بیٹی سے مخاطب ہو رہی تھی کہ تم ان لڑکیوں کے پاس کھڑی ہو تو میں تمہاری تصویر بناؤں مگر وہ لڑکی اس کی بھانجی تھی شرما کر پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میں عربی سن کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کہاں سے آئی ہیں آپ؟''

''میں کویت سے'' میرے میاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''میں ان سے مل چکی ہوں' آپ سے ملنے کا شوق تھا

مگر شاید آپ گھومنے نکلی تھیں۔"

"جی، میں سن سٹی گئی ہوئی تھی۔" اس لڑکی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "یہ بیٹی ہے آپ کی؟"

"نہیں، میری بھانجی ہے۔"

"آپ جج ہیں؟"

"نہیں، میں محکمہ انصاف میں کام کرتی ہوں۔"

"او۔۔۔۔۔۔۔مل کر خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی۔"

میں نے اس کی جانب دیکھا تو کامدار میکسی پہنے ہوئے تھی۔ بھانجی نے کالی پینٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ سرخ و سپید دبلی پتلی لڑکی شرمیلی سی میرے سامنے کھڑی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ہال کھچا کھچ بھرنے لگا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں جام نظر آنے لگے اور یہاں تک کہ مرد کم پیتے دکھائی دے رہے تھے ان کی نسبت عورتیں زیادہ پی رہی تھیں۔ اتنے میں پرویز حسن لائیر جو لاہور سے آئے ہوئے تھے ان سے میری ملاقات میرے شوہر نے کروائی۔ علیک سلیک کے بعد میں ایک کونے میں بچھی تین کرسیوں کی جانب بڑھی تو ایک نوجوان جوڑا وہاں بیٹھا تھا، خالی کرسی دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

"شور" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے علیک سلیک کی اور مجھے بتایا کہ میں کینیڈا سے آئی ہوں اور میرے شوہر کا تعلق یورپ سے ہے۔ وہ پرکشش لڑکی تھی، لڑکے کی جانب دیکھا تو اس کی یورپینز جیسی چھاپ تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا، تم واقعی یورپین دکھائی دے رہے ہو۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

"میں پاکستان سے۔"

"کیا جج ہیں؟"

"نہیں، میرے شوہر چیف جسٹس آف پاکستان ہیں۔"

"آپ ضرور لائیر ہوں گی۔"

''وہ بھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔ہاں' لکھاری ہوں۔''

''واؤ۔۔۔۔۔۔۔''اس نے خوش ہو کر کہا۔''رائٹرز مجھے بہت پسند ہیں۔ مجھے پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ میری سہیلی پاکستان گئی تھی' اس نے واپس آ کر بہت تعریفیں کی تھیں کہ پاکستان بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔''

''اچھا۔۔۔۔۔۔۔یہ تو بالکل اس نے صحیح تعریف کی تھی' پاکستانی واقعی بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔''

ہم آپس میں باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہ پاکستان آنے کے لیے اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی کہ میرے میاں مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تو میں نے ان دونوں کا تعارف ان سے کروایا۔ وہ لڑکی بضد تھی کہ ہمیں پاکستان بلایا جائے۔ ریاض مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''امید پر دنیا قائم ہے۔ انشاءاللہ بلانے کی کوشش کریں گے۔''

ان کو کیا بتاتے کہ تیسری دنیا کے لوگوں کے لیے بلانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہاں ہم چاروں حالات حاضرہ پر باتیں کر رہے تھے اور وہ کینیڈا کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ دنیا میں خوبصورت کون سے مقام ہیں تو میں بتا سکتی ہوں کہ کینیڈا اور اس کا شہر وینکوور بہت خوبصورت ہے۔''

''واہ۔۔۔۔۔۔۔آپ کی چوائس بہت اچھی ہے۔ میں کینیڈا میں رہتی ہوں۔ اس کے مقابلے میں ساؤتھ افریقہ اتنا خوبصورت نہیں ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا۔ لیکن ساؤتھ افریقہ کا اپنا چارم ہے۔ مختلف جگہ ہے' باقی ملکوں سے ہٹ کر۔''

''خوب کہا آپ نے' میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔''

تیکھے نین نقش کی سرخ و سفید دبلی پتلی حسین لڑکی تھی۔ اس کے برعکس سامنے بھاری بھرکم تیز آواز میں افریقی گانے گاتے ہوئے ناچ رہی تھیں۔ مشروب کا دور چل رہا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ افریقی لڑکیوں کے ساتھ اکلوتا لڑکا ناچ میں مصروف تھا۔ بنجاروں کی طرح ان کے زیور تھے جو انہوں نے اپنے لباسوں کی مناسبت سے پہنے ہوئے تھے۔ ہر کسی کا تعارف دوسرے شخص سے کروایا جا رہا تھا۔

جب لوگ پی پی کر تھک گئے اور وہ ناچ ناچ کر اپنے جسموں کو مٹکا مٹکا کر لوگوں سے داد لے چکی تو ڈائننگ ہال کا دروازہ کھول دیا

گیا۔ یہ ہال ڈائننگ ہال سے منسلک تھا۔ باری باری لوگ اندر کی جانب بڑھے جہاں پر میزیں ہی میزیں لگی تھیں۔ ہر ایک جج یا چیف جسٹس کی میز پر اس کے نام کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ چیف جسٹس صاحبان کی میز عین سٹیج کے سامنے لگی تھی۔ یعنی پانچ میزیں سامنے اور باقی سارے ہال میں۔ سٹیج پر پیانو' ساز اور گانا گانے کے لیے مائیک لگے تھے۔

میزوں کے اوپر سلاد اور بن مکھن پہلے سے ہی رکھے ہوئے تھے۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے سلاد کھانا شروع کر دیا۔ میرے قریب تھائی لینڈ کے چیف جسٹس کی اہلیہ اور اس کا شوہر بیٹھے تھے۔ ویٹرلڑکی ڈرنک کا آرڈر لے رہی تھی تو میں نے ڈائٹ کوک لانے کے لیے کہا۔ اور اس خاتون نے کھولتا ہوا گرم پانی اپنے اور شوہر کے لیے مانگا۔ ہم نے آپس میں علیک سلیک کی تو میں نے پوچھا۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''تھائی لینڈ سے۔۔۔۔۔۔۔میاں میاں چیف جسٹس ہیں۔''

حالانکہ میں نے پڑھ لیا تھا۔ ان کے بیج کے اوپر لکھا تھا' مگر پھر بھی پوچھ لیا۔

''آپ۔۔۔۔۔۔۔؟''

''میں پاکستان سے ہوں۔''

اس کا شوہر میرے میاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ بتانے لگی۔

''ہم آپ کے شوہر سے مل چکے ہیں مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔''

''جی' صبح میں شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔'' اس کو میں نے بتا دیا تھا۔ اتنے میں کولڈ ڈرنک ویٹرلڑکی لے آئی اور ان کے لیے پانی' جس سے بھاپ نکل رہی تھی۔

''اتنا گرم پانی آپ پئیں گے؟''

''ہم دونوں کا گلہ خراب ہے۔ ابلا ہوا گرم پانی گلے کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔''

''تو آپ باقاعدہ اس کا استعمال کرتی ہیں؟''

''نہیں' ٹھنڈا بھی پی لیتے ہیں' مگر آج گلے کی وجہ سے گرم پی رہے ہیں۔''

''اچھا' میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ ہمیشہ ہی ایسا پیتی ہیں کیونکہ جب میں چین گئی تھی تو وہ لوگ گرم پانی اور قہوہ ہر وقت پیتے ہیں۔''

''ٹھیک کہا آپ نے' چین میں گرم قہوہ بہت پیا جاتا ہے۔ مجھے بھی بہت پسند ہے۔ مگر کبھی کبھی ٹھنڈا پانی بھی پینے کو جی کرتا ہے۔''

ویٹرلڑکا کھانے کا آرڈر لینے لگا۔ میں نے پوچھا کہ ''چکن حلال ہے؟'' تو وہ بولا۔ ''نہیں، فش حلال ہے۔''

''مینو میں فش نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیا مل سکتی ہے؟''

''جی، مل جائے گی۔ اگر فش نہیں دیں گے تو آپ کیا کھائیں گی۔''

تھائی لینڈ کی جج کی اہلیہ اسے آرڈر دیتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''ہم دونوں کے لیے بھی حلال فش لے آؤ۔''

اسی طرح میرے میاں نے بھی فش آرڈر کر دیا۔ باقی کے جج صاحبان نے چکن اور بیف آرڈر کیا۔ میری دائیں جانب تھائی لینڈ کے چیف جسٹس کی اہلیہ اور بائیں جانب ساؤتھ افریقہ کے چیف جسٹس بھاری بھرکم سیاہ فام بیٹھے تھے۔ مجھ سے علیک سلیک کی اور بیف کے لیے آرڈر دے دیا تھا۔

سامنے میوزک کا پروگرام شروع ہو گیا تھا۔ ہال کی چھت کے اوپر بڑے ہی مدھم بلب روشن کیے ہوئے تھے۔ سٹیج پر بھی بہت روشنی نہیں تھی۔ ہال میں زیادہ تر افریقی بیٹھے تھے۔ مدھم روشنیوں میں ان کے چہرے اور بھی گہری رنگت کے ہو گئے تھے۔

جب گانا کورس کی صورت میں شروع ہوا تو ایک گوری کے ساتھ افریقی اور افریقی لڑکی کے ساتھ گورا۔۔۔۔۔۔ تو یوں معلوم ہونے لگا جیسے دن اور رات مل گئے ہوں۔

لہک لہک کر اور چہک چہک کر انہوں نے گانا شروع کر دیا تھا۔ لوگ بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کے گانے اور ناچ دیکھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ جوشیلے انداز میں تالیاں بھی بجا رہے تھے۔ کورس میں گانا ختم ہوا تو ایک افریقی لڑکی جس نے پاکستانی طرز سے گلٹ کا ہار اور لہنگا سیٹ پہنا ہوا تھا' گانے میں مصروف ہو گئی۔ گو کہ ان کی زبان ہم نہیں سمجھ سکتے تھے مگر ساز اور گائیکی عمدہ تھی۔ جس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ اس کا گانا بھی ختم ہو گیا تھا۔ پھر ایک بار کورس کی صورت میں گانا شروع ہوا تو لوگوں نے بھرپور تالیاں بجائیں۔ کھانا آنے سے پہلے لمبی لمبی تقریریں ہوئیں۔ مندوبین کا شکریہ ادا کیا جا رہا تھا کہ دور دراز ملکوں سے آ کر انہوں نے رونق بخشی۔

آرڈر کے مطابق فش آ چکی تھی۔ ساتھ ڈائیٹ کوک بھی لے آیا تھا۔ میں دل ہی دل میں تھائی لینڈ کے جوڑے کو سراہ رہی تھی کہ کیسے حلال کھانا کھاتے ہیں حالانکہ ان کے نزدیک حلال حرام کیا ہے۔ ابھی اتنا ہی سوچا تو میں نے دیکھا کہ ان کی اہلیہ کے پاس ویٹر وائن کا گلاس لے آیا تھا۔ چیف جسٹس آف تھائی لینڈ نے پانی سے ہی اکتفا کیا۔ میں حیران تھی' کھانا حلال کھاتی ہیں اور ساتھ ہی شراب پیتی ہیں۔ میں حیرانگی سے شراب کے دوسرے گلاس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر خود ہی گویا ہوئی۔

''گلہ خراب ہے' دوا کی صورت میں پی رہی ہوں' کھانا بالکل حلال کھاتی ہوں۔''

میں نے سوچا۔

''کھانا حلال کھاتی ہیں اور پیتی۔۔۔۔۔۔۔'' لیکن میں نے کہا کچھ نہیں۔ ہر ایک اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہاں صرف یہی لوگ تھوڑی تھے جو پینے والے تھے' باہر کے ملکوں سے آئے لوگ سب پیتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے ساتھ بھی پی رہے تھے۔

مچھلی اچھی بنی تھی۔ ساری اوپر سے چیز کو ہٹا کر میں نے مچھلی کھانا شروع کر دی تھی۔

سٹیج پر ایک گروپ اور آ گیا تھا۔ ان میں ایک موٹی' ایک پتلی اور ایک بہت ہی موٹی خاتون اتنی موٹی کہ جب کولہے ہلاتی تو یوں معلوم ہوتا کہ دو تکیے کمر کے نیچے رکھے ہوں۔ جب زور سے کولہے ہلاتی ناچ کرتے ہوئے تو لگنے لگا کہ یہ دو تکیے نیچے گر جائیں گے۔ اس موٹی فربہ خاتون نے کالا لباس پہنا ہوا تھا باقی لڑکیوں نے افریقہ کا ایسا لباس زیب تن کیا ہوا تھا' جیسے ٹارزن فلم میں جنگلیوں کے لباس ہوتے ہیں۔ زیور بھی کچھ اس طرح کے تھے۔ اس موٹی خاتون کو ذرا بھر بھی احساس کمتری نہیں تھا کہ میں اتنی موٹی ہوں۔ وہ اپنے ناچ میں مگن تھی۔

میری پچھلی میز پر کینیڈین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے جوش آیا تو اپنی کرسی سے اٹھی اور ڈانس کرنے لگی۔ اس کے برابر والی کرسی سے ایک شخص افریقی اٹھا اور ڈانس کرنے لگا۔ وہ پرکشش لڑکی ناچتی ہوئی ان مدھم روشنیوں کو پرنور کرنے لگی تھی۔ یوں معلوم ہونے لگا کہ ہال کی روشنیاں تیز ہو گئی ہوں۔ پھر اس کے بعد ایک اور شخص اٹھا۔ وہ تینوں کے ساتھ ناچ کرنے لگی تھی۔ اس کا شوہر پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ میں حیران تھی کہ کتنے شوق سے دیکھ رہا ہے۔ ہمارے کلچر میں ایسا کہاں کہ شوہر داد بھری نظروں سے دیکھے۔ وہ لڑکی اتنی حسین تھی کہ لوگوں کی اسٹیج سے نظریں ہٹ کر ہال کے درمیان اس لڑکی کے رقص پر پڑ رہی تھیں تو خیال آیا' حسن۔۔۔۔۔۔۔ حسن ہی ہوتا ہے۔ آخر میں جب تھک کر شوہر کے قریب بیٹھی تو اس نے خوش دلی سے ہاتھ ملایا تو میں اور بھی حیران ہو گئی تھی۔

اسٹیج پر گانا مسلسل ہو رہا تھا۔ آخر میں ایک بار وہ لڑکی پھر اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا شوہر بھی جوش میں آ گیا تھا اور چند اور لوگ بھی رقص میں شامل ہو گئے تھے۔

کھانے کا اختتام ہو رہا تھا۔ پلیٹیں اٹھائی جا رہی تھیں اور میٹھا رکھنا شروع کر دیا گیا تھا۔ مختصر سا کھانا دس بیس ڈشوں میں بنی نہیں تھا۔ سلاد' چکن یا فش اور ایک میٹھے کی پلیٹ۔۔۔۔۔۔۔ اللہ اللہ اور خیر صلا۔۔۔۔۔۔۔

کچھ لوگ اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے میاں کی جانب اشارہ کیا کہ چلنا چاہیے۔ مسلسل تین گھنٹوں سے گانا چل رہا تھا۔ لوگ ابھی تک گانا سننے میں مشغول تھے۔ مگر چند لوگوں کو جب جاتے دیکھا تو ہم بھی واپس اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔

دوسری صبح جوہانسبرگ کے ٹور پر جانے کے لیے میں تیار تھی۔ میرے علاوہ کانفرنس پر آئی ہوئی خواتین بھی جانے کے لیے تیار تھیں۔ سو صبح نو بجے کا وقت مقرر ہوا تھا۔

جوہانسبرگ کا ٹور لینے کے لیے کانفرنس میں مدعو ایک جج صاحب کی اہلیہ نے وہ ٹور لینے کے لیے مجھے بھی آمادہ کیا۔ جب میں نے جانے کے لیے حامی بھری تو کچھ خواتین جو کانفرنس میں مدعو تھیں وہ بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔

جیسا کہ لکھ چکی ہوں، صبح نو بجے کا ٹائم مقرر ہوا اور کانفرنس کی منتظم خاتون نے ہم سے کہا کہ ''ٹھیک نو بجے کے قریب میں ہوٹل کے لاؤنج میں سب کا انتظار کروں گی۔''

''دوسرے دن صبح نو بجے تمام خواتین ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئیں۔ اور منتظم خاتون کے ساتھ بس میں بیٹھ گئی۔ ہم دس گیارہ خواتین تھیں اور بس خراماں خراماں ہوٹل کی ویران آبادی سے نکل کر دور بہت دور نکل آئی تھی۔ راستے میں وہی سوکھا ہوا سبزہ ہمارا ہمراہی تھا۔ بغیر پتوں کے درخت سڑک کے کنارے تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ کہیں کہیں سبزہ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ بس میں بیٹھی ہوئی گائیڈ خاتون بتا رہی تھی۔ موسم بہار میں ہر سو ہریالی نظر آتی ہے۔ اتنا سبزہ ہوتا ہے کہ یہ شہر بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔

خواتین دور دراز سے آئی ہوئی تھیں۔ ان میں یورپین، امریکن لنڈن کے علاوہ افریقہ سے بھی آئی ہوئی تھیں جو کہ سیاہ فام تھیں۔ کلچر اور تعلیم یافتہ ہونے کے ناطے ان کے لباس بھی بڑے مہذب تھے۔ گفتگو بھی شستہ انگریزی میں کر رہی تھیں۔ صرف دشواری تو افریقن دکانداروں کے ساتھ تھی جو کہ انگریزی میں بول چال بمشکل کر سکتے تھے۔ دور سے پہاڑ اور پہاڑیوں کے اوپر گھر دکھائی دینے لگے تھے۔ ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی۔ موسم ابر آلود تھا۔ خواتین آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔

ایک افریقن لیڈی کسی جج (جو کہ کانفرنس اٹینڈ کر رہے تھے) کی اہلیہ تھیں، ڈربن سے جوہانسبرگ آئی تھیں، صرف ٹور لینے کے لیے۔۔۔۔۔۔ کسی نے بتایا تھا کہ سن سٹی اور جوہانسبرگ کا ٹور بہت اچھا کرایا جاتا ہے۔ حالانکہ افریقی تھی مگر جوہانسبرگ کا ٹور اور مقامات نہیں دیکھ سکی تھی۔ وہ میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی اور بتا رہی تھی کہ افریقہ میں رہتے ہوئے خواہش یہی ہوتی تھی کہ باہر کی دنیا

دیکھی جائے۔ جب کبھی بھی افریقہ کے شہروں میں کانفرنس ہوتی تو مجھے خیال ہی نہیں آتا تھا کہ مقامات دیکھوں۔ اس سے میں نے پوچھا۔

جوہانسبرگ گو کہ موسم بہار میں بہت خوبصورت ہے۔ کیا کیپ ٹاؤن جو کہ ساؤتھ افریقہ کا خوبصورت ترین شہر ہے جس کو جنت سے تشبیہ دی ہوئی ہے کیا وہ بھی نہیں دیکھا۔ ''یقین جانئے' وہ بھی دیکھنے سے قاصر ہوں۔ دراصل میں بھی انصاف کے دفتر میں ملازمت کرتی ہوں۔ صبح کی گئی ہوئی شام کو لوٹتی ہوں۔ اسی طرح میرے شوہر بھی بہت مصروف ہیں۔ ہم لوگ اتنے تھک جاتے ہیں کہ سارا ہفتہ سوائے ویک اینڈ کے کہیں نہیں نکلتے۔ صرف ویک اینڈ پر یا تو مووی دیکھ لیتے ہیں۔ کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھا لیتے ہیں اور یا۔۔۔۔۔۔ آدھے یا گھنٹے کی ڈرائیو پر کسی اچھے سے سپاٹ پر پکنک منا لیتے ہیں۔''

''پھر گھرداری کیسے چلتی ہے؟''

''چل ہی جاتی ہے۔ ہم سب۔۔۔۔۔۔ میاں اور دو بچے۔۔۔۔۔۔ اپنا اپنا کام خود کرتے ہیں۔ جس کا موڈ ہوا ویک اینڈ میں کھانا بنا لیتا ہے اکثر میرے میاں ویک اینڈ باربی کیو کرتے ہیں اور دوستوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔''

''جج صاحب خود باربی کیو کرتے ہیں۔'' وہ جسٹس کی اہلیہ تھیں۔ اور وہ صاحب نہ صرف باربی کیو کرتے بلکہ برتن بھی ڈش واشر میں لگاتے تھے۔ ان کے دوست بھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ یہ سب باتیں تو میرے ذہن میں تھیں کہ باہر کی دنیا میں رہنے والے لوگ' خاص کر شوہر حضرات اپنا کام اور گھر کا کام بھی کرتے ہیں۔ مگر جسٹس صاحب گھر میں کام کرتے تھے تو صاف ظاہر تھا کہ چاہے کتنی بڑی پوسٹ پر کوئی فائز کیوں نہ ہو۔ وہ شخص بغیر کام کئے نہیں رہ سکتا۔

بس اپنی خاص رفتار پر چل رہی تھی۔ اب کہیں کہیں سبزہ اور کھیت دکھائی دینے لگے اور کچھ فاصلے پر باغ بھی نظر آنے لگے تھے۔ پھر ان باغوں کے باہر سڑک کے کنارے پر کئی لوگ ریڑھیوں پر فروٹ فروخت کر رہے تھے۔ آنے جانے والی گاڑیاں وہاں کھڑی ان سے سستے داموں میں فروٹ خرید رہی تھیں۔ سڑک صاف ستھری تھی اور کسی قسم کی کوئی گندگی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بس ایک زبردست فرق تھا کہ سیاہ فام لوگوں کی اکثریت تھی۔ ہر جگہ ہر کونے میں وہ دکھائی دیتے تھے۔ لہٰذا یہاں فروٹ بھی سیاہ فام عورتیں فروخت کر رہی تھیں۔ جوہانسبرگ کا ٹور شروع تھا۔ یہاں کی سڑکوں اور باشندوں' گلی کوچوں سے انفرادیت ٹپک رہی تھی اور ان کی چیزیں جو ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں' دنیا بھر میں مشہور تھیں۔ محنتی قوم تھی اور محنت میں کوشاں تھی۔

باتیں کرتے کرتے وہ خاتون خاموش ہو کر کھڑکی کے باہر کا نظارہ لے رہی تھی۔ ہوٹل سے لے کر اب تک کا سفر گو بہت سبزہ

دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر انتہائی خوب صورت لگ رہا تھا۔ کہیں کہیں پام کے درخت اور پھولوں کے تخت بھی نظر آتے تھے۔ یہ بس کارلٹرن سنٹر کی طرف رک گئی جہاں ٹاپ آف افریقہ یعنی افریقہ کی چوٹی پر چڑھ کر پورے شہر کا منظر دیکھا جاتا تھا۔

وہاں پہنچ کر اوپر چوٹی سے شہر اتنا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا' یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جہاز پر بیٹھ کر کھڑکی سے سارا شہر دیکھ رہی ہوں۔ وہاں پر موسم میں کچھ زیادہ ہی خنکی آ گئی تھی۔ اونچائی کی وجہ سے موسم سرد ہو گیا تھا۔ یہاں سے سارے شہر کی عمارتیں' سبزہ' سوکھا ہوا نہیں تھا بلکہ سرسبز دکھائی دے رہا تھا۔ بڑا ہی دلفریب منظر تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد ایک بار پھر بس میں بیٹھ گئے تھے۔ بس کا روٹ بدل گیا تھا' اب تاریخی عمارتوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بہت سی تاریخی عمارتیں' میرے سامنے تھیں۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر شہر کے اس حصے کی سیر کروائی گئی جو میل ویل (Melville) کہلاتا ہے۔ یہ فنکاروں کی جگہ تھی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے فنکارانہ دنیا کی سیر کرائی گئی تھی۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ ایمارینٹیا (Ammarentia) کے باغات سے ہوتے ہوئے عالمی شہرت کے علاقے سوویٹو کا دورہ کرایا گیا۔ وہاں نیلسن منڈیلا کا گھر ہے' جو اسی حالت میں انہوں نے نگہداشت کر کے رکھا ہوا ہے۔ وہ تمام مقامات یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے خواب میں ان کی سیر ہو رہی ہے۔ افریقہ کا اپنا ہی چارم اور اپنی ہی دنیا ہے۔ میرے ساتھ جو خواتین اس ٹور میں شامل تھیں وہ محظوظ ہوتے ہوئے اپنے کیمروں میں ان مناظر اور مقامات کو بند کر رہی تھیں۔ دنیا کو دیکھنے اور پرکھنے کا انہیں بھی شوق تھا۔ ایک ساتھ گھوم پھر کر ان کے ساتھ خاصی جان پہچان ہو چکی تھی۔ مختلف ممالک سے ان کا تعلق تھا مگر یہاں پر ایک خاندان کی طرح آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ منتظم خاتون بھی بڑی سمارٹ اور ہنس مکھ تھی۔ گو کہ سیاہ فام تھی مگر جدید لباس اور اچھے اخلاق سے خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ تمام خواتین فنکاروں کی دنیا اور ان کے مقامات سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ یہ تو جوہانسبرگ میں سیر ہو رہی تھی مگر افریقہ کے باقی شہروں اور مقامات کے بارے میں منتظم خاتون بتا رہی تھی اور خاص کر کے جنوبی افریقہ میں مشہور ہیروں کی کان پریمیئر کان ہے۔ یہ تاریخی اعتبار سے دنیا کی قیمتی ترین کانوں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ ہیرا جسے ''سٹار آف افریقہ'' یعنی افریقہ کا ستارہ کہتے ہیں' اس کان میں ملا تھا۔ یہ ہیرا تین ہزار ایک سو چھ کیرٹ کا تھا۔

لیسڈی (Lescdi) گاؤں میں ثقافتی تفریح کی جگہ ہے یہاں پر جنوبی افریقہ کے مختلف قبائل بستے ہیں۔ اور وہاں پر ہر سیاح اور ان کے مختلف رقص اور گانوں سے محفوظ ہوتے ہیں اور وہاں پر ان قبائل کے مختلف اور مخصوص کھانے بھی ملتے ہیں۔ جیسے میں نے کانفرنس کے دوران مختلف قبائل کے رقص دیکھے تھے اور کھانے بھی کھا چکی تھی۔

جنوبی افریقہ میں کچھ ایسے حصے ہیں جہاں جنگلات اپنی حالت میں یعنی اصلی حالت میں بھرپور طریقے سے آباد اور انہوں نے

محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ افریقہ کے جنگلات تو مشہور ہیں مگر انہوں نے ان کی کاٹ چھانٹ نہیں کی بلکہ انہیں اور بھی گھنا ہونے کا موقعہ دیا تھا اور کئی حصوں میں سیاحوں کی دلچسپی اور تفریح کے لیے مختلف جگہیں مخصوص کی ہوئے ہیں۔ رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست بھی خاص طور پر ہے۔ ایک جگہ پر پانچ جنوبی افریقہ کے ہاتھیوں کو رکھا گیا تھا اور ہر ہاتھی کی اپنی اپنی شخصیت ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور شیروں کی جنگل میں ایک خاص جگہ ہے' یہاں جا کر شیروں کو اپنے قدرتی ماحول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور جگہ ہے جہاں چیتا اور چند دیگر جانوروں کا سنٹر ہے۔ یہاں پر لوگ جا کر ان جانوروں کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں مختلف معلومات رکھتے ہیں۔ وہ خاتون بڑی خوبصورتی کے ساتھ جنوبی افریقہ کے باقی مقامات کی زبانی تفریح کروا رہی تھی۔ اس منتظم گائیڈ خاتون کی باتیں تمام خواتین بڑے غور و خوض کے ساتھ سن رہی تھیں۔ پھر بتانے لگی۔

ذولو سلطنت کی شاندار تاریخ اور بھرپور رنگ برنگی شاندار ثقافت ہے۔ جنوبی افریقہ میں کوذولو نتال جنت کا ٹکڑا ہے۔ وہاں پہاڑ' سمندر اور جنگلات سب موجود ہیں اور وہاں تاریخی جنگی میدان بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ بحر ہند کے ساحلی علاقوں میں سارا سال موسم خوشگوار رہتا ہے۔ ڈارا کنبرگ کے پہاڑ دنیا کے شاندار ترین پہاڑی سلسلوں میں سے ایک ہیں۔ اس علاقے میں دو بڑے علاقے عالمی ثقافتی ورثے کا مقام رکھتے ہیں اور اسی نام کے تحت محفوظ ہیں۔ ایک ڈارا کنبرگ کے پہاڑوں کے بیچ ہے اور دوسرا مقام سینٹ لوسیا (St. Lucia) کا دلدلی زمین والا حصہ ہے جہاں دلدل کے مخصوص جانور اور پودے پائے جاتے ہیں۔

وہ ہمیں سب کچھ جنوبی افریقہ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ واپسی پر بھی سفر خوشگوار گزرا۔ جنوبی افریقہ کے بارے میں کافی معلومات مل چکی تھیں اور کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں واپس جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کچھ افریقہ کے مقامات کو جنت کے ٹکڑے سے تشبیہہ دیتے ہیں اور وہ خود بے چارے سیاہ فام تھے۔ قدرت بھی دیکھیں۔۔۔۔۔۔۔ خدا ہر انسان اور قوم کی کمی کہیں نہ کہیں پوری ضرور کر دیتا ہے۔

ہوٹل پہنچ کر عشائیہ کے لیے تیاری کرنے لگی تھی۔ یہ عشائیہ کانفرنس میں آئے ہوئے مندوبین کے لیے دیا جا رہا تھا۔ ابھی میں تیار ہی ہو رہی تھی کہ ریاض کا فون کمرے میں آیا۔

''تم ابھی تک تیار نہیں ہوئی ہو۔۔۔۔۔۔۔ میں ہوٹل کے لاؤنج میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''بس صرف دس منٹ لگیں گے۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا اور واقعی ہی جلدی جلدی تیار ہوئی اور کاٹج سے باہر نکل گئی۔

سن سٹی (Sun City) دیکھ کر میرے خیالات تبدیل ہو چکے تھے۔ جوہانسبرگ واقعی ہی اپنے اندر ایک خاص خوبصورتی سمیٹے ہوئے تھا۔ جب پہنچی تھی تو اس کو ایک نظر میں پورا نہیں دیکھ پائی تھی۔ افریقہ کا اپنا ہی مقام ہے۔ ہر ملک کی تہذیب وتمدن اور ان کا کلچر مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا کلچر بھی باقی کے ممالک سے فرق تھا۔ خدا خدا کر کے ان کو آزادی ملی تھی ورنہ وہ محکومیت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کا سلوک بھی گوروں کے ہاتھوں سے ایسا ہوتا جیسا کہ ہندو برہمن شودر کے ساتھ کرتے تھے۔ ان لوگوں کو حقیر جانتے ہوئے رشتے ناطے تو کجا ان سے ملنا جلنا اور برابری کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان افریقیوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ تو اچھے سکولوں کالجوں اور کلبوں میں ممبر شپ نہیں لے سکتے تھے۔ اب ان کی حکومت تھی۔ یہ اپنے ارمان نکال رہے تھے۔ مگر ابھی بھی ان کو تعصب کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کانفرنس میں ایک خاتون نے بتایا کہ کہنے کو ایک نیگرو کو صدر بنا لیتے ہیں مگر ابھی تک اپنی من مانی کرتے ہیں۔ لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ ان کی کایا پلٹی ہوئی تھی۔ ہر جگہ ہر بڑے بڑے بنکوں' سکولوں' کالجوں اور شاپنگ سنٹروں میں انہوں نے ملازمتیں اختیار کی ہوئی تھیں۔ جہاں ایک گورا ہے تو دس افریقی اس کے ساتھ نظر آئیں گے کیونکہ آتے بھی کیوں نا وہ ان کا ملک ہے۔ اور ہر کوئی اپنے ملک میں ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔ نہ صرف افریقہ بلکہ دنیا کے کونے کونے میں ان لوگوں نے محنت کر کے اپنا نام کمایا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔ جہاں اتنے سارے لوگ محنتی ہیں وہاں ان کا ایک خاص طبقہ امریکہ اور دیگر ممالک میں پاکٹ مار ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ صرف یہی طبقہ پاکٹ مار ہے بلکہ ہر ملک میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اچھے بھی اور برے بھی۔ مگر ان پاکٹ ماروں کی لوگوں کے دلوں میں بڑی دہشت ہے کہ راہ چلتے ہوئے کا لے لوٹ لیتے ہیں۔ خواہ مخواہ دل دہشت کھا جاتا ہے۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں کانفرنس روم میں گئی تو حسب معمول سیشن جاری تھا۔ بہت بڑا ہال کھچا کھچ بھرا تھا کوئی بھی سیٹ خالی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ جج صاحبان اس ہال کے درمیان آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مائیک ان کے آگے رکھے ہوئے تھے۔ سوال جواب ہو رہے تھے۔ ہال کی نشستوں کے پیچھے مختلف کیبن تھے جہاں ہر زبان میں ان کے سوال جواب اور ان کی تقریروں کا ترجمہ ہو رہا تھا۔ صرف ہمارے ملک کی زبان میں نہیں۔ دوپہر کے وقت لنچ اسی ہوٹل میں کرنا تھا۔ میں کچھ دیر کانفرنس روم میں بیٹھی اور پھر باہر لابی میں پہنچ گئی۔ وہاں پر وہی کویت سے آئی ہوئی لڑکی بیٹھی تھی خالہ تو اندر کانفرنس میں مصروف تھی۔ اور وہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر اپنا وقت پاس کر رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''آنٹی میں تو اندر بور ہی تھی۔ سیر کے لیے آئی تھی مگر خالہ کو وقت ہی نہیں کہ سیر کروا سکے۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم سیر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں اپنے ہمراہ سن سٹی جوہانسبرگ کے ٹور پر ساتھ لے جاتی۔''

''وہ تو میں خالہ کے ساتھ کل چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔۔۔خالہ نے وعدہ کیا ہے۔''

''تمہاری خالہ کے کتنے بچے ہیں؟''

''خالہ نے شادی نہیں کی۔''

''کیوں؟''

''مزاج کا لڑکا نہیں ملا۔۔۔۔۔۔۔اور ویسے بھی۔۔۔۔۔۔۔'' وہ خاموش ہوگئی تھی۔

''کیا؟''

''کیا؟''

''وہ دھیرے سے بتانے لگی۔

''خالہ کا کیریئر خراب ہوجاتا۔شوہر نے انہیں کام نہیں کرنے دینا تھا۔''

''تو کیا پاکستان کی طرح کے آپ کے ملک کے حالات ہیں؟''

''اس سے بھی زیادہ خراب۔۔۔۔۔۔۔کئی شادیاں کر لیتے ہیں۔بنیادی طور پر ہم عربی ہیں۔اسلام میں چار شادیاں جائز ہیں اور آزاد خیال خالہ کیسے گوارہ کرتیں کہ شوہر دوسری شادی کرلے۔اور ویسے بھی ہر بات میں مرد اسلام کو بیچ میں لے آتے ہیں۔''

''آپ کی امی نے کیسے شادی کر لی؟''

''میری امی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں لہٰذا ان کی شادی ہوگئی ہے اور ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔میری تین مائیں اور بھی ہیں۔''

''تین۔۔۔۔۔۔۔'' حیرت سے میں نے پوچھا۔

''پانچ پانچ بچے ان سے بھی ہیں۔''

''یعنی بیس بچے ایک آدمی کے۔''

وہ لڑکی ہنس پڑی۔

''جی آنٹی۔۔۔۔۔۔۔ابھی تو بہت تھوڑے ہیں۔بعض لوگوں کے تو چالیس چالیس تک بچے ہوتے ہیں۔''

''ایک بیوی سے؟''

''نہیں' چار پانچ بیویوں سے۔''

''مگر اسلام میں تو چار شادیاں جائز ہیں۔۔۔۔۔۔۔ پانچویں کیوں؟''

وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

''پانچ سے بھی کئی گنا زیادہ بیویاں ہوتی ہیں اور ہر بیوی سے بچے بھی کافی ہوتے ہیں۔ کئی بیویاں تو ایک ہی گھر میں ہوتی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ چھوٹی بیگمات دوسری گھر میں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں مسکرا پڑی۔

''یہ کہ پہلی ایک یا دو تو ایک گھر میں۔۔۔۔۔۔۔ اور جو نوجوان بیوی آتی ہے اس کو علیحدہ گھر میں رکھتے ہیں۔''

''سب گھل مل کر رہتے ہیں۔''

''جی آنٹی بس۔۔۔۔۔۔۔ دل میں گھٹن ضرور ہوتی ہے۔ اب میری امی کو دیکھو وہ تو بس جی رہی ہیں۔ منہ سے کچھ نہیں بولتیں مگر دل کا حال میں جانتی ہوں۔ کوئی بھی عورت شراکت پسند نہیں کرتی۔''

''تو تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''نصیب میں ہوئے تو ضرور کروں گی۔ کوشش کروں گی کہ کسی عربی سے نہ کروں۔''

''اگر ماں باپ کرنا چاہیں تو۔۔۔۔۔۔۔؟''

''میں انکار کر دوں گی۔ ویسے بھی خالہ نے مجھے پالا پوسا ہے' ان کی اولاد تو ہے نہیں' ماڈرن تھنکنگ کی ہیں۔ وہ کبھی مجھے فورس نہیں کریں گی۔ شادی میری مرضی کے مطابق کریں گی۔''

''اور اگر باپ نے اعتراض کیا تو۔۔۔۔۔۔۔؟''

''عربی زبان کے بہت پکے ہوتے ہیں۔ خالہ کے سامنے نہیں بول سکتے۔ مجھے خالہ کے حوالے کرتے وقت انہوں نے خالہ کو کہا تھا اس کی شادی کا اختیار تمہیں ہوگا۔''

وہ بچی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ اتنے میں لنچ بریک ہوئی تو تمام جج صاحبان کانفرنس ہال سے نکل کر ڈائننگ ہال کی جانب جانے لگے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنے میاں کو آتے دیکھا تو اس لڑکی کو خدا حافظ کہا اور ان کے ساتھ ڈائننگ ہال میں چلی گئی۔ کئی میزیں لگی تھیں۔ مختلف قسم کی ڈشز' سلاد کئی قسم کے فروٹ' خاص کر کے مالٹوں کی کئی قسمیں تھیں۔ بڑے سے

لے کر چھوٹے تک دور سے وہ مالٹے ٹماٹر دکھائی دیتے تھے۔ کوئی ڈش ایسی نہیں تھی جو ہمارے مطلب کی ہو۔ ساگ تھا وہ بھی پنیر میں پکا ہوا۔ کچی پکی سبزیاں تمام کی تمام پنیر میں پکی ہوئیں۔۔۔۔۔۔۔ اتنا سارا پنیر دیکھ کر ان کے موٹاپے کا احساس ہو گیا تھا کہ پنیر کی زیادتی سے وہ اتنے موٹے تازے ہیں۔ بیف اور چکن بھی تھا۔ لوگ زیادہ تر بیف کھا رہے تھے۔ میں نے تھوڑا سا کٹا ہوا فروٹ لیا اور کچھ سائیڈ پر سلاد ڈال کر کھانا کھانے لگی۔ تھائی لینڈ کی لیڈی سے پھر ملاقات ہوئی تو وہ حلال ویٹر سے پوچھنے لگی۔ ویٹر بتانے لگا' جب چکن تیار کر رہے تھے تو اس پیکٹ کے اوپر حلال لکھا ہوا تھا آپ چکن کھا سکتی ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کا گلا ٹھیک ہوا ہے کہ نہیں۔''

''کافی افاقہ ہے۔ آج بھی وائن کا گلاس پیوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ وہ بوفے کی میز پر پہنچ گئیں۔

''اچھا''

وہ خاتون تو میرے لیے معمہ بن گئی تھی۔ حلال کھانا اور ساتھ وائن۔۔۔۔۔۔۔ ذہن اس چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ حلال کھانے کے ساتھ اگر وائن پی جائے تو حلال کھانے کا کیا حشر ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ کیا کھانا حلال رہ جائے گا؟ یہ ایسا سوال تھا کہ میرا ذہن اس کا جواب نہ دے سکا تھا۔

ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ میرے میاں نے انڈیا کے چیف جسٹس سے میرا تعارف کروایا۔ ان کی اہلیہ اس وقت کسی اور میز پر بیٹھی کھانا تناول کر رہی تھیں۔ میں نے ان سے علیک سلیک کی تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

''انڈیا کا چکر لگا تو ضرور آئیں۔''

''جی'' ایک دم سے بوکھلا گئی تھی۔ وہاں جانا کوئی آسان نہیں تھا۔ دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔ ''ضرور آئیں گے۔''

میں ایسی میز پر بیٹھی تھی جو باہر ٹیرس پر تھی۔ اندر بہت رش تھا۔ ان سب کی سرگرمیاں باہر بیٹھے دیکھ سکتی تھی۔ ویٹر لڑکیاں سیاہ فام تھیں۔ تلفظ کی غلطی تھی یا ان کے ذہن کی' بات ذرا دیر سے سمجھتیں۔ اگر پوری بات سمجھ میں نہ آتی تو کسی گورے ویٹر کو لے آتی تھیں۔ اس کے آنے سے مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ غرض کہ کھانا ڈھونڈنے سے حلال مل ہی گیا تھا۔ مگر اس کو کھانا دل گردے کا کام تھا۔ ٹیسٹ کچھ اچھا نہیں تھا۔ کالج میں جانے کی جلدی بھی تھی کیونکہ چار بجے ڈربن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ پونے دو بج رہے تھے۔ ابھی پیکنگ بھی کرنی تھی۔ تھوڑی بہت چیزیں جو ان پیک تھیں ان کو سمیٹ کر باکس میں رکھنا تھا۔ میں نے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کھا بھی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ کارڈز ایکسچینج ہو رہے تھے۔ نئی نئی دوستیاں بن رہی

تھیں۔غرض کہ ہر کوئی مگن تھا' مصروف تھا۔ان لوگوں نے شاید آج کا دن وہیں رہنا تھا' انہیں کسی قسم کی جلدی نہیں تھی۔بڑے آرام اور سکون کے ساتھ کھا پی رہے تھے۔ذرا بھی ٹینشن نہیں تھی۔یہ ٹینشن صرف تیسری دنیا کے بسنے والے ملکوں کے لیے ہوتی ہے۔

کہنے کو تو یہ بھی تیسری دنیا کے رہنے والے لوگ تھے۔مگر ان کے ملک اور شہر کو دیکھ کر ذرا بھی گمان نہیں ہوتا تھا کہ ان کا تعلق بھی تیسری دنیا سے ہے۔ہم لوگوں کی نسبت انہوں نے بہت ترقی کی ہے۔ان کے باغات' پارک' شاپنگ مال دیکھ دیکھ کر رشک پیدا ہو رہا تھا کہ اس سیاہ فام قوم نے اپنی آزادی کا لوہا منوایا ہے بلکہ اپنے ملک کو بھی بنایا اور سنوارا ہے۔

کمرے میں داخل ہوئی تو سیاہ فام لڑکی چہرے پر اداسی لائے کمرہ صاف کر رہی تھی۔پریشان' پریشان سی تھی۔

مجھے اندر آتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''آج چیک آؤٹ ہے آپ کا؟''

''ہاں' پیکنگ کرنا چاہتی ہوں۔''

''ضرور کریں' میں نے کمرہ مکمل صاف کر دیا ہے۔''

اس کی اس بات سے میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ اداس لگی۔

''تم پریشان ہو؟''

اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''یس میم''

''کیوں؟''

''میرے ہسبنڈ نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''کیوں دھوکہ دیا؟''

''بس۔۔۔۔۔۔۔شادی سے پہلے اس کا چکر کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔دونوں میں جھگڑا ہو گیا تھا اور شادی نہ ہو سکی تھی۔میرے میاں نے مجھ سے شادی کر لی تھی اور بتایا نہیں تھا کہ میری گرل فرینڈ کے ساتھ دوستی رہ چکی ہے۔اب جس آفس میں وہ کام کرتا تھا اسی آفس میں اس کی گرل فرینڈ بھی ملازمت کرنے لگی تھی۔مجھے معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ رات کو کیوں دیر سے آتا ہے۔ان کی دوبارہ

دوستی ہو گئے تھی اور میں نے آفس جا کر دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ گھنٹوں اس کے آفس میں بیٹھی رہتی ہے۔ جب شوہر سے پوچھا تو اس نے سچ سچ بتا دیا ہے کہ میرا عشق تھا اور اب میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میاں کی بات سے میں پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے فریب میں آ کر شادی کر لی تھی اور اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں ڈاکٹر کے پاس آج صبح گئی تھی کہ ابارشن کروائی جائے مگر اس نے بتایا کہ اب بہت لیٹ ہو چکا ہے۔ میں اس بات سے آج صبح سے پریشان ہوں کہ اس شخص کی وجہ سے میری زندگی برباد ہو گئی ہے اور جو آنے والا بچہ ہے وہ باپ کی شکل نہیں دیکھ سکے گا۔''

اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ افریقی لڑکی دبلی پتلی تھی' تیکھے نین نقش کی۔۔۔۔۔۔۔ کسی حد تک پرکشش تھی۔

''کیا افریقہ میں بھی لوگوں میں اتنی آزادی ہے کہ جب چاہے کسی کا ہاتھ تھام لیا جاتا ہے؟''

''یہاں پر بھی لوگ بہت ظالم ہیں' فلرٹ کرتے ہیں اور شادی کے بعد چھوڑ بھی دیتے ہیں' مگر سب ایسے نہیں ہوتے۔ کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں۔ وہ شادی کے بعد باوفا رہتے ہیں۔ میم کیا بتاؤں کہ میرے میاں نے کس طرح اپنے دام میں مجھے پھانسا۔ بتایا کہ میں بہت امیر ہوں' اچھی جاب پر ہوں' تم چاہو تو کام کرنا ورنہ آرام بھی کر سکتی ہو۔''

''پھر تم نے جاب کیوں کی؟''

''بچے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے سوچا' جب تک بچہ نہیں آتا تو پارٹ ٹائم جاب کر لوں۔ آفس میں بھی ملازمت ملتی تھی۔ لیکن میرا گھر یہاں سے واکنگ ڈسٹنس پر ہے۔ ویسے تو میری ڈیوٹی ریسیپشن پر بھی لگتی ہے۔ کچھ دنوں سے اوور ٹائم کرنے کے لیے کمروں کی صفائی بھی کر لیتی ہوں۔''

دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد وہ قدرے سنبھل گئی تھی۔

''اب اگر وہ شادی کرے گا تو تم کیا کرو گی؟''

''کرنا کیا ہے' گھر مجھے مل جائے۔ وہ پیسے والا ہے' شادی کر کے نیا گھر لے لے گا۔''

''مگر تم نے چپ چاپ اجازت دے دی ہے۔''

''میں احتجاج کروں تو اس کی شادی عارضی طور پر رک سکتی ہے مگر میں اس فریبی کے ساتھ کیوں رہوں۔ آزاد ہوں' میرا بھی حق ہے آزادی سے جینے کا۔ مجھے پرواہ نہیں۔''

میں لاجواب ہو گئی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کے کونوں میں آنسو چھپے ہوئے تھے۔ لاکھ رونا نہیں چاہتی تھی مگر غم سے اس کا سینہ پھٹا

جارہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا۔ کہ دنیا کے کسی بھی خطے کو لے لیں' مرد اپنی بڑائی چاہتا ہے۔ عورت کو کمزور سمجھتے ہوئے اس سے بے وفائی کرتا ہے۔ عورت ہر جگہ مظلوم ہے اور ازل سے مظلوم چلی آ رہی ہے۔ زمانہ بدل رہا ہے' قدریں بدل گئیں مگر مرد کی فطرت ویسے کی ویسے رہی۔ فطرت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے مگر کسی کی فطرت کو بدلنا چاہیں تو بدل نہیں سکتی' وہ ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ ہم تیسری دنیا کی بسنے والی عورتوں کے ساتھ مرد ظلم کرتے ہیں مگر ان خواتین کو دیکھیں جو باہر کے ملکوں میں رہتی ہیں۔ انہیں حکومت کی طرف سے بھرپور تعاون حاصل ہوتا ہے مگر اس کے باوجود مرد کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کوئی بھی عورت چاہے مشرقی ہو یا مغربی' اپنا گھر خراب نہیں کرنا چاہتی۔ اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ میرے بچے اور گھر جنت کا گہوارہ ہو۔ مشرقی عورت تو مرد کا ظلم سہہ لیتی ہے' مگر مغرب میں ایسا نہیں ہوتا۔ شوہر نے کچھ کہا تو وہ اسے گھر کے باہر نکال دیتی ہے اور گھر کی مالکہ بن جاتی ہے۔

وہ لڑکی جا چکی تھی۔ ہوٹل سے منسلک کاٹجز آہستہ آہستہ خالی ہو رہی تھیں۔ چند لوگ ہمارے ساتھ ہی باہر نکل رہے تھے۔ سامان پیک ہو گیا تھا۔ اور میں جب کاٹج سے نکل کر ہوٹل کی جانب جا رہی تھی تو راستے میں بہتا فوارہ اور اس کا تالاب سورج کی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ پرانے زمانے اور پرانی صدیوں کی یاد تازہ کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہاں اس قدر خاموشی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وقت تھم گیا ہے۔ اور واقعی احساس ہوتا تھا کہ ہم صدیوں پیچھے چلے گئے ہیں' کوئی ٹریفک کا شور نہیں تھا۔ سنسان اور ویران فاصلے فاصلے پر ہر کاٹج کھڑی تھی۔ اندر رہنے والے مسافروں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کون سے شہر سے آئے ہیں اور انہوں نے آگے کہاں جانا ہے۔ اس وقت تو دنیا بھر کے ججز اور وکلاء ان میں آن کر آباد ہوئے تھے۔ ان کاٹجز میں رونق لگ گئی تھی۔ ویرانے میں بہار آ گئی تھی۔ مگر چند روز کے لیے پھر یہاں کا ماحول اداس کر دینے والا ہو جانا تھا۔ ابھی ہوٹل تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ میرے شوہر بمعہ پروٹوکول آفیسر کے کاٹج کی جانب آ رہے تھے۔ اس وقت ہم نے جوہانسبرگ کو خیر باد کہہ دینا تھا۔ جانے سے پہلے میں آسیہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر موبائل پر اس کا نمبر Busy جا رہا تھا۔ میں نے زاہد صاحب کو کہا کہ ائیر پورٹ پہنچ کر میری ان سے بات کروا دیں تو انہوں نے حامی بھر لی تھی۔ ڈرائیور اور زاہد صاحب نے مل کر سامان گاڑی میں رکھا اور ہم لوگ ائیر پورٹ کی جانب چل پڑے۔ راستے میں کنٹری سائیڈ سے گزرتے ہوئے' بابرا کارٹ لینڈ کے ناول یاد آ گئے تھے۔ ان ناولوں میں اس طرح کی کاٹجز اور فارم ہاؤس پڑھنے کو ملتے تھے۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے کہ میں یہاں پہلے بھی آ چکی ہوں۔ نوجوانی کے عالم میں پڑھے ہوئے ناول آج بھی ذہن پر نقش ہیں۔ ناولوں کے مطابق اسی طرح کا ماحول اور سین دیکھنے کو مل رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب

درخت آہستہ آہستہ سرسبز دکھائی دینے لگے تھے۔ سوکھے گھاس نے ہرے گھاس میں تبدیل ہونا شروع کر دیا تھا۔ یہ شہر کے باہر کا علاقہ تھا' جہاں سے ڈاؤن ٹاؤن دور تھا۔ پورے شہر کے بارے میں اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شہر کیسا ہے۔ گاڑی کم ٹریفک کی وجہ سے خاموشی سے ائیر پورٹ کی جانب بھاگ رہی تھی۔

ائیر پورٹ پہنچ کر بورڈنگ کارڈ حاصل کئے اور دستی سامان لے کر لاؤنج میں بیٹھ کر جہاز کی اناؤنسمنٹ کا انتظار کرنے لگے۔

لوگ لاؤنج میں بیٹھے کافی' چائے' پی نٹ' چپس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے ستا رہے تھے۔ ڈربن جانے کے لیے صرف پچاس منٹ درکار تھے۔ جب بورڈنگ شروع ہوئی تو جہاز کی اگلی نشستوں میں جگہ مل گئی تھی۔ مسافر بیٹھے تو جہاز چل پڑا۔ کوک' جوسز سے تواضع کرنے کے بعد کھانا بھی سرو کیا گیا۔ میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ سٹورڈلڑکا میرے لیے لیے ایلچی کا جوس اور پی نٹ لے آیا تھا۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ پچاس منٹ پل بھر میں گزر گئے تو ڈربن پہنچنے کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ جہاز شہر کے اوپر سے گزر رہا تھا بلکہ سمندر کے اوپر سے۔۔۔۔۔۔۔ یہ شہر کافی خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ ساحل سمندر (Beach) پر لوگ سیر و تفریح کر رہے تھے۔ سڑکوں پر گاڑیاں اور فٹ پاتھوں پر لوگ چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں پر سبزہ سوکھا ہوا نہیں تھا بلکہ سرسبز دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان پر بادلوں کا رقص جاری تھا۔ سورج نے ہلکی سی آنکھیں موندی ہوئے تھیں۔ ابر چھایا ہوا تھا۔ عمارتیں اونچی اور سمندر کا پانی جا بجا دکھائی دے رہا تھا۔ غرض کہ میں نے اوپر سے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ شہر خوبصورت ہے۔ جہاز لینڈ کرنے کے لیے تقریباً عمارتوں سے ذرا اونچا اڑ رہا تھا۔ اس لیے شہر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

سامان کی وصولی کے لیے جانے والے تھے کہ اشرف مشہود صاحب حبیب بنک کے اچھے عہدے پر فائز تھے' ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان کی رہنمائی میں سامان جلدی ٹرالی میں رکھا گیا۔ ڈرائیور اور گاڑی بھی اپنے ہمراہ لائے تھے۔ سارے پروگرام کا انہیں علم تھا۔ سو ہم سے پوچھنے لگے کہ آپ سیدھا ہوٹل جائیں گے کہ کہیں اور۔۔۔۔۔۔۔"

"سیدھا ادھر ہی چلئے۔" ریاض نے انہیں جواب دیا۔

ہلٹن ہوٹل میں ہمارے رہنے کا کانفرنس والوں نے بندوبست کیا ہوا تھا۔ اچھا' صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ سامان اور کمرے کی چابی لے کر ہم نے مشہود صاحب کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے ہم سے پوچھا۔

"جو بھی پروگرام ہے ہمیں بتائیں تا کہ گاڑی بھیج سکوں۔"

کانفرنس ایک روز بعد تھی۔ ہم لوگ فارغ تھے۔ سو انہیں کہا کہ کل گیارہ بجے گاڑی بھیج دیں تھوڑی سی تفریح کر لیں گے۔

''ٹھیک ہے' کل گیارہ بجے آپ تیار رہیے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔ سامان بھی کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ رات کا وقت تھا ہمیں جوہانسبرگ میں بتایا گیا تھا کہ ڈربن میں بہت سے پاکستانی کھانوں کے ریستوران ہیں۔ لہٰذا ہوٹل میں کھانا کھانے کے بجائے ہم نے ریسیپشن میں کھڑے لڑکے سے معلومات حاصل کرتے ہوئے پوچھا کہ کوئی پاکستانی ریستوران نزدیک ہے تو بتاؤ۔ وہ چھوٹے سے کیبن میں گھس کر ایک حلال فوڈ کی کتاب لے آیا' جو چند صفحوں پر مبنی تھی۔ وہ ہمیں راستہ بتاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں سے پانچ منٹ کی ڈرائیو پر مائے ڈائز ریستوران ہے۔ کھانا اچھا ہے' ضرور جائیں۔''

''لیکن ہم تو ابھی آئے ہیں۔ کسی ٹیکسی کا بندوبست کر دیں۔''

میری بات سے اس نے ٹیکسی والے کو فون کیا اور چند منٹوں میں وہ آ گیا اور پندرہ رینڈ پر وہاں پہنچانے کی حامی بھرنے لگا تھا۔ پندرہ رینڈ پاکستانی تقریباً سو روپے کے برابر تھے۔ باہر کے ملک کے حساب سے کوئی خاص رقم نہیں لگی تھی۔ ہم لوگ وہاں واقعی ہی پانچ یا چھ منٹوں میں پہنچ گئے۔

وہ صاف ستھرا ریستوران تھا دو پاکستانی لڑکوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک کا تعلق کراچی سے تھا اور دوسرا لاہور کا رہنے والا تھا۔ جب میں نے بتایا کہ ہم بھی لاہور کے ہیں تو وہ لڑکے بہت خوش ہوئے اور کھانے کا آرڈر لینے لگے۔ بھوک اس وقت بہت لگی تھی۔ میں نے اس لڑکے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جو بھی لاؤ بس تازی چیز لانا۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں' سب کچھ تازہ ہوگا۔''

دال اور چکن آلو کی کری کا آرڈر دے کر میں ریستوران کی دائیں جانب کی دیوار کو دیکھنے لگی تھی۔ جہاں پر خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں۔ دل میں خوشی پیدا ہو رہی تھی کہ پردیس میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا نام لینے والے موجود ہیں۔

تھوڑی دیر انتظار کروانے کے بعد وہ کھانا لے آئے تھے۔ مرچ مصالحہ کم بتایا تھا مگر وہ چٹپٹا کھانا لا کر بولے ان میں رنگ سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ مرچیں تیز نہیں ہیں مگر جب میں نے منہ میں پہلا نوالہ ڈالا تو خاصی مرچیں تھیں۔ مگر بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہم نے وہ کھانا شوق سے کھایا اور کھانے کے بعد ان سے ٹیکسی منگوائی اور ہوٹل پہنچ گئے۔ دو تین گھنٹے خیریت سے گزر گئے مگر آدھی رات کو ریاض کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میرے پیٹ میں بھی ہلکا ہلکا درد تھا۔ جو کھانا وہ محبت سے کھلا رہے تھے اس کھانے نے اپنا جوبن دکھا

دیا تھا۔شاید باسی کھانا تھا' جس سے ریاض کو تکلیف ہوئی تھی۔ باہر کے ملکوں میں اکثر جاتے ہیں اور ہر جگہ کھانا کھاتے ہیں۔ اچھا بھی اور سستا بھی مگر کھانے کی کوالٹی بہترین ہوتی ہے۔ چور' چوری سے چلا جائے مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ باہر کے ملکوں میں باسی کھانا کھلانا جرم ہوتا ہے۔ مگر ہمارے پاکستانی دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں اپنا رنگ ضرور دکھائیں گے۔ کیوں نہ دکھائیں ان کے خون میں بے ایمانی رچی ہوتی ہے۔ چاہے کہیں کیوں نہ جائیں وہ فراڈ ضرور کریں گے۔ ان لڑکوں نے بھی تازہ کھانا کہہ کر باسی کھلا دیا تھا۔ وہ تو پاکستان سے لائی ہوئی ادویات کام آئیں جو کھاتے ہی افاقہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ پردیس میں بیمار ہونا کسی مصیبت سے کم نہیں ہوتا۔

ہلٹن ہوٹل میں صاف ستھرا آرام دہ کمرہ تھا۔ نیچے لابی میں ایک طرف دکانیں جیولری کی' سویٹر کی اور مختلف ملبوسات کی تھیں۔ ڈربن میں بھی کانفرنس تھی۔ یہاں پر بھی بہت سے ملکوں سے آئے ہوئے لوگ نظر آ رہے تھے۔ لابی کے ایک سائیڈ ٹیبل کا بہت بڑا گھوڑا اور میٹل کا ہی ایک شخص تیر ہاتھ میں پکڑے ہوئے سوار تھا۔ کاؤنٹر پر صرف ایک گوری لڑکی نظر آ رہی تھی باقی سب سیاہ فام ۔۔۔۔۔۔ ہوتے بھی کیوں نہ' ان کا ملک تھا۔ وہ آزادی سے یہاں ملازمتیں اختیار کئے ہوئے تھے۔ کافی لوگ ہونے کے باوجود کوئی شور شرابا نہیں تھا۔ صبح کا وقت تھا' ناشتے کے لیے ڈائننگ ایریا پہنچی تو وہاں پر لوگ پہلے سے ہی اپنی اپنی میزوں پر براجمان تھے۔ بہت بڑے ہال کے دروازے شیشوں کے تھے جہاں سامنے پہاڑوں کا منظر بھی دیکھ سکتے تھے۔ یہاں ڈربن میں پہاڑ بھی تھے' سمندر اور بلڈنگز کافی اونچی تھیں۔ یہاں پر زندگی کی گہما گہمی تھی ورنہ جوہانسبرگ میں وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

مختلف قسم کے جوسز بڑے بڑے جاروں میں پڑے تھے اور وہ جار مشین کے ذریعے گھوم رہے تھے۔ آڑو کا جوس' امرود کا جوس' مکس پھلوں اور اورنج کا۔۔۔۔۔۔ غرض کہ جوسز کے علاوہ دنیا بھر کی الٹی پلٹی اشیاء کھانے کے لیے بوفے کی صورت میں لگی تھیں۔ ایک کاؤنٹر پر انڈے حسب منشا تلے جا رہے تھے۔ اسی بڑے سے فرائی پین میں سور' چکن اور بیف تلتا اور اسی میں انڈا تلا جا رہا تھا۔ سامنے سب کچھ دیکھ کر کچھ کھانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ پھر میں نے ابلے ہوئے انڈے کی فرمائش کر دی تھی۔ گو کہ سنا یہی تھا کہ ناشتہ بھی پاکستانی مل جاتا ہے مگر صبح سویرے ناشتے کے لیے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ سو اسی ہوٹل میں ہی ناشتہ پر اکتفا کیا۔ اس ڈائننگ ہال میں نہ صرف کانفرنس پر آئے ہوئے لوگ تھے بلکہ کافی سیاح بھی موجود تھے جو گھومنے کے لیے جوہانسبرگ اور دیگر کئی علاقوں سے آئے تھے۔ ایک پاکستانی بینکر سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ بمعہ اپنی فیملی کے جوہانسبرگ کے نواحی علاقے سے یہاں سیر کے لیے آیا تھا۔

اس کی اہلیہ نے مجھ سے کہا۔

''ہمیں پاکستان سے آئے ہوئے بیس سال ہو گئے ہیں۔ مختلف جگہوں سے پوسٹنگ ہوتے ہوئے جوہانسبرگ کے نواحی علاقے میں ہوگئی ہے۔ جتنا چھوٹا شہر ہوتا ہے اتنی ہی سہولتیں ہوتی ہیں۔ نوکر' ڈرائیور اور صفائی کے لیے مہترانی۔۔۔۔۔۔۔ غرض کہ یہاں پر ہمیں بہت آرام ہے۔''

''پاکستان کبھی گئی ہیں آپ؟''

وہ مسکرائی۔

''جانے کو بہت جی کرتا ہے مگر والدین وفات پا گئے ہیں اس لیے ہم دنیا کی سیر کر لیتے ہیں۔ ہر سال بینک کی طرف سے فری ٹور کی آفر ہوتی ہے۔ وہ ہم بچوں کے ساتھ گھوم پھر لیتے ہیں۔ پانچ چھ سالوں کے بعد پاکستان بھی چلے جاتے ہیں۔''

''پاکستان رہنا پسند ہے آپ کو؟''

''پسند تو ہے' مگر تنخواہیں بہت تھوڑی ہیں جن سے بچوں کی تعلیم بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہاں ڈالرز میں تنخواہیں ملتی ہیں اور مہنگائی بھی باقی ملکوں سے کم ہے۔ اس لیے خواہش اور ضرورت بھی یہی ہے کہ ہم باہر ہی رہیں۔ ویسے بھی بہت سی مشکلات ہیں۔ ہر کام بہت دیر سے ہوتا ہے۔ بیس سالوں میں عادت سی پڑ گئی ہے کہ کام وقت سے ہوں۔''

وہ دھیرے دھیرے ناشتہ کر رہی تھی۔ اس کی میز بالکل میرے قریب تھی۔ تین بچے بھی اس وقت ہمراہ تھے۔ میں اس کی باتوں میں مشغول ہوگئی تھی۔ جواب دیتی بھی تو کیا دیتی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر کام بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ بائی لیولز کے لوگوں کی زبانی میں نے پاکستان میں سنا تھا کہ کام وقت پر نہیں ہوتے' التواء میں پڑے رہ جاتے ہیں۔ تو میں نے ان سے کہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اگر آپ لوگوں کے کام نہیں ہوتے تو سوچیں ذرا غریب لوگوں کے کام کیسے ہوتے ہوں گے۔ وہ میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگی تھیں' اس چیز کا مجھے بہت احساس ہے مگر ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ غریب لوگوں کے مسائل حل ہو جائیں۔ لہٰذا ناشتہ کی میز پر بیٹھی خاتون سے تکرار کرنا فضول تھا۔ پھر وہ مجھے دیکھ کر گویا ہوئیں۔

''ویسے بھی چوریاں ڈکیتیاں ہو رہی ہیں۔ دہشت گردوں دہاڑے لوٹ کر چلتے بنتے ہیں۔''

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہاں پر بھی تو یہی حال ہے۔ لٹیرے ہر جگہ گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔''

''مانتی ہوں' مگر یہاں ہمارے پاس اتنا سرمایہ جمع ہو جاتا ہے اگر لٹیرے لوٹ بھی لیں تو ہم بھوکے نہیں رہ سکتے۔''

وہ بضد تھیں کہ یہاں پر ہر طرح سے ہم خوشحال ہیں۔ میں اس کی باتوں کا جواب دیتی بھی تو کیا دیتی۔ پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہے' بس اچھا سسٹم نہیں جس کے تحت ہر جگہ شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

وہ افریقہ کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتا رہی تھی کہ باقی ملکوں کی طرح یہاں پر بھی سہولتیں ہیں۔ اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ کئی سالوں سے وہ اپنا وطن چھوڑ آئے تھے۔ غیر ممالک میں رہتے رہتے انہیں عادت ہوگئی تھی اس لیے بھی پاکستان کی کوئی قدر و قیمت ان کی نظر میں نہیں تھی۔

ناشتہ کے بعد میں ڈائننگ ہال سے نکل کر ہوٹل کی دکانوں کی جانب چلی گئی۔ ایک دکان جہاں پر شتر مرغ کے انڈے جو چھ انچ چوڑے اور چھ انچ ہی لمبے ہوں گے' ان پر پینٹنگ اور کٹ ورک کا کام کیا ہوا تھا' بڑی ہی پرکشش ایلین خاتون سیل گرل تھی۔ میں ان انڈوں کے علاوہ بہت ساری چیزیں جو افریقہ کی بنی ہوئی تھیں انہیں دیکھنے لگی تھی۔ اس سے سینری والے انڈے کی قیمت معلوم کی تو اس نے بتایا۔ ''آٹھ سو رینڈ کا ایک انڈا ہے۔''

''آٹھ سو۔۔۔۔۔۔۔ اتنا مہنگا؟''

وہ مسکرائی۔

''ہوٹل میں تو چیزیں آپ کو مہنگی ہی ملیں گی۔ آپ اگر دلچسپی رکھتی ہیں تو باہر سے ان کی خریداری کر لیں۔''

''یعنی کہاں سے ملیں گے؟''

''ڈاؤن ٹاؤن میں۔'' پھر خود ہی بتانے لگی۔ ''یہاں سے ڈاؤن ٹاؤن دور تھوڑی ہے۔ چند منٹوں کی پیدل واک پر ڈاؤن ٹاؤن آجاتا ہے۔ وہاں ہوٹل کی نسبت چیزیں سستی ہیں۔''

میں حیران تھی کہ اتنی صاف گو خاتون تھی جو مجھے ڈاؤن ٹاؤن میں خریدنے کے لیے اکسا رہی تھی۔ ورنہ دکاندار گاہک کو واپس جانے نہیں دیتے اور چکنی چپڑی باتوں سے گاہکوں کو پھانس لیتے ہیں اور زبردستی انہیں مجبور کرتے ہیں چیزیں خریدنے کے لیے۔

مجھے پاکستان کے دکاندار یاد آنے لگے تھے۔ وہ گاہکوں کا بھلا نہیں سوچتے انہیں صرف اپنی غرض ہوتی ہے' صرف روپیہ بنانے کی۔

''آپ کب سے یہاں ملازم ہیں؟'' میں اس خاتون سے کافی متاثر ہوئی تھی۔

''بہت عرصے سے یہاں ملازمت اختیار کی ہوئی ہے۔''

میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ کافی حسین تھی۔

''کہاں سے آئی ہیں؟''

''اٹلی سے۔۔۔۔۔۔۔میرے شوہر افریقی ہیں۔وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اٹلی آئے تھے اور وہیں پر میری ملاقات ہوئی اور شادی ہوگئی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''افریقی سے؟''

''جی' بہت اچھا شوہر ہے۔۔۔۔۔۔''

ابھی میں کچھ اور ہی پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا سکول سے آ گیا تھا۔بچہ سیاہ فام تھا اور وہ انتہائی حسین' گورے رنگ کی تھی۔میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی تو وہ بڑے فخر سے بتانے لگی۔

''یہ بالکل اپنے باپ سے ملتا ہے۔''

''اچھا'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''آپ خوش ہیں؟''

''بہت۔۔۔۔۔۔۔انڈر سٹینڈنگ کی بات ہے۔بہت لائق اور ذہین ہے میرا شوہر۔''

وہ شوہر کے گن گا رہی تھی۔بچہ گو سیاہ فام تھا لیکن بڑا باتمیز اور کم گو دکھائی دے رہا تھا۔

شادی بیاہ کے معاملے میں گورے اور نیگرس کی شادی کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی تھی۔اسی طرح نیگرو اور گوری کی شادی بھی پھلتی پھولتی ہر جگہ دکھائی دے رہی تھی۔آزاد ملک تھا۔ان کی قدریں بھی آزاد تھیں۔سماج کی پرواہ کئے بغیر جہاں جی آتا وہاں شادیاں رچا لیتے تھے۔کبھی ان کا آپس کا میل ملاپ کم دیکھنے میں نظر آتا تھا۔لیکن اب ان کا راستہ صاف تھا۔جہاں چاہیں وہ شادیاں کر سکتے تھے۔

میں اس دکان سے نکلی ہی تھی کہ ریاض لابی میں کھڑے تھے۔شاید بازار جانے کے لیے تیار تھے۔

میں نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''چلیں سامنے جیولری کی دکان پر چلتے ہیں۔'' جو ریسیپشن کے عین سامنے تھی۔

ہوٹل کی لابی میں بہت ساری دکانیں آس پاس تھیں۔ایک جیولری کی دکان میں داخل ہوئی تو ایک خاتون بیٹھی تھی۔دبلی پتلی اور گوری رنگت کی تھی۔میں نے شوکیس میں رکھی ہوئی جیولری کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔''یہ اصلی ہیں کہ نقلی؟''

وہ مسکرایے۔ ''بالکل اصلی ہیں' بلکہ گارنٹی شدہ ہیں۔''

میں نے ایسے ہی اس سے ایک انگوٹھی کی قیمت پوچھی تو کئی ہزار رینڈ اس نے بتایا تو خیال آیا اتنی مہنگی جیولری لینی تو ہے نہیں پھر پوچھنے کا کیا فائدہ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

اس وقت میرے میاں بھی ہمراہ تھے۔

''پاکستان سے۔''

''بہت دور ہوگا؟''

''کافی دور ہے۔۔۔۔۔۔۔ آپ کہاں سے آئی ہیں؟'' کیونکہ اس کے چہرے کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ اس ملک کی نہیں ہے۔ مجھے بتانے لگی۔

''میں سپینش ہوں۔ میری ماں بھی سپین کی ہے' آج کل میرے ساتھ ہے۔ ملازمت کی غرض سے آئی ہوں۔''

''کتنے بچے ہیں آپ کے؟''

وہ مسکرائی۔

''میں نے شادی نہیں کی ہے۔ میری ماما بالکل اکیلی تھیں اور معذور بھی۔ میں نے ان کی خاطر شادی نہیں کی ہے۔ دنیا میں سب کچھ ہی میری ماما ہے۔ میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔ اگر میں شادی کر لیتی تو ماما کا کیا ہوتا۔ وہ کس کے سہارے جیتی۔ میں حیران سی اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ اس خاتون میں ماں کی تابعداری کرنے کا اتنا جذبہ تھا کہ شادی نہیں کی تھی۔ یہی سنا اور دیکھا جاتا تھا کہ بوڑھے والدین کو اولڈ ہاؤسز میں پھینک دیتے ہیں۔ مگر ان لوگوں میں بھی چند ایسے لوگ ہیں جو والدین کی اطاعت کرتے ہیں۔ بڑھاپے میں ان کا خیال رکھتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''ماما گھر میں اکیلی رہتی ہیں؟''

''اکیلی۔۔۔۔۔۔۔ بالکل اکیلی' مگر میں کھانا بنا کر دے آتی ہوں۔ وہ ویل چیئر پر بیٹھی مائیکرو ویو پر کھانا گرم کر لیتی ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی ماما کی طبیعت ٹھیک ہو تو میرے لیے کھانا بھی بنا لیتی ہیں۔ مگر ماما بے چاری معذور ہیں۔ چھٹی کے دن میں ان کو گھمانے کے لیے بیچ پر لے جاتی ہوں۔ سمندر ماما کو بہت پسند ہے۔ اور شاپنگ مال میں بھی لے جاتی ہوں۔ ماما ہفتہ بھر گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔

بس ویک اینڈ کا انتظار کرتی ہیں۔ جوں ہی جمعہ کا دن آتا ہے تو ماما باغ باغ ہو جاتی ہیں۔ ہائے' میری ماما چل پھر نہیں سکتیں۔'' وہ خاتون ایک سانس میں سب کچھ بتانے لگی تھی۔

میں اس کی باتیں سن سن کر حیران ہو رہی تھی کہ دنیا میں اچھی اولاد ہر جگہ موجود ہے۔ نہ جانے اس کی ماں کی کیا نیکی تھی جو دنیا میں ہی اس کو اجر مل رہا تھا۔ وہ پھرتیلی سی خاتون ۴۸ سال کے لگ بھگ تھی۔ ماں ۷۵ سال کی ضرور ہوگی۔ سچ ہے کہ مقافات عمل ضرور ہے۔ اس کی ماں نے اپنی ماں کی خدمت کی ہوگی' جو اس کو اپنی بیٹی کے روپ میں صلہ ملا ہے۔ کسی بھی قوم کے بارے میں رائے دینے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہر قوم میں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی۔ وہ سپینش عورت دنیا میں نیکی کما رہی تھی۔ خدا اس کی نیکیوں کو دیکھ رہا ہے۔ ضرور کسی نہ کسی بات میں یا کام میں اسے فائدہ ضرور ہوگا۔ کیونکہ اللہ کا فرمان ہے کہ مجھ تک پہنچنے کے لیے پہلے میرے بندوں سے پیار کرو' پھر مجھ تک رسائی پا سکو گے۔ اللہ نے تو نہ صرف والدین بلکہ ساری مخلوق کے لیے حکم دیا ہے۔ لوگوں کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ اور ان کی تکلیفیں دور کرو۔

مجھے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''اس وقت آپ باہر جانے والے ہیں؟''

''جی''

''پلیز' اپنا بیگ اور جیولری اتار کر جایئے گا۔ راہ چلتے ہوئے پرس چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔'' دراصل ونڈو شاپنگ کا بہانہ ہی تھا' ہم اس سے پوچھنے گئے تھے کہ یہاں ہوٹل سے شاپنگ مال کتنی دور ہے۔ اس وقت میرے میاں فارغ تھے۔ اکیلے لوگوں کی اتنی ساری باتیں سن کر جانے کو جی نہیں کرتا تھا۔ مگر جب اس نے یہ بتایا کہ چلتے ہوئے پرس چھین لیتے ہیں تو میں نے جواب دیا۔

''پرس میں صرف کیمرہ اور نوٹس بک ہے۔''

''پھر ٹھیک ہے۔ ہاتھوں سے انگوٹھیاں اتار کر میں نے میاں کی جیب میں ڈال دیں۔ جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ وہ پکارنے لگی۔

''یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ کس طرح دو لڑکے اس دکان میں گھس گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ شوکیس کا شیشہ کاٹنے کو تھے کہ مجھ میں نہ جانے کہاں سے ہمت آ گئی تھی کہ ایمرجنسی کا بٹن دبا دیا تھا' جس چیئر پر بیٹھی تھی بٹن اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس طرح جان بھی بچ

گئی اور جیولری بھی۔"

"ایمرجنسی بٹن دباؤ تو ایک دم سے آجاتے ہیں؟"

"بالکل' یہ ہوٹل کے مالک کی دکان ہے۔ اس کے اردگرد وہ پہرہ دے رہے ہوتے ہیں۔ جھٹ سے سمجھ جاتے ہیں کہ دکان پر غلط گاہک آگیا ہے۔"

میں نے اسے کہا۔ "دیکھا' تم ماما کی خدمت کرتی ہو' اللہ نے تمہیں بال بال بچالیا ہے۔"

"بالکل سچ کہا ہے آپ نے' میں نے گھر جا کر ماما کو یہی کہا تھا۔"

اس کی اس بات سے میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگی تھی جو حفاظتی تدابیر بتا کر ہمیں آگاہ کر دیا تھا۔ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے دکان سے باہر نکل آئے تھے۔

ہلٹن ہوٹل کے درمیان سڑک کو پار کر کے دوسری جانب چلنا شروع کر دیا تھا۔ پانچ منٹ پیدل چلنے کے بعد مال آگیا تھا۔ یہاں بہت بڑا گروسی سٹور تھا اور دیگر اشیاء کی دکانیں بھی۔ مگر اتنا بڑا نہیں تھا کہ جتنے ہوتے ہیں۔ کچھ تصویریں کھینچی ہوئی تھیں۔ ان کو دھلوانا چاہتی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب کیمرہ شاپ تھی۔ ہوٹل کی دکان میں بہت ریٹ اونچے تھے۔ سو یہاں ایک خاتون دکان میں اکیلی کھڑی تھی۔ تصویریں لوگوں کو کھینچ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے میں ان کی ڈویلپنگ کے لیے وقت دیا اور ریٹ بھی ہوٹل کی نسبت سستے تھے۔

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا۔ مال گو کہ چھوٹا تھا مگر گہما گہمی بہت تھی۔ زیادہ مہنگا بھی نہیں تھا۔ آمنے سامنے دکانیں اور سنٹر میں چھوٹے چھوٹے ریستوران تھے۔ ایک جگہ پر "چکن بریانی حلال" لکھا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک لڑکی تھی۔ شکل وصورت سے افریقی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"تم مسلمان ہو؟"

"یس میڈم۔۔۔۔۔۔۔ میرے فادر پاکستان کے ہیں' مگر میری پیدائش یہاں ہوئی ہے۔"

افریقہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی شکل وصورت بھی افریقیوں کی طرح ہوتی ہے۔

وہ پوچھنے لگی۔ "کیا کھائیں گے آپ؟"

''جو بھی ہو' مگر تازہ ہو۔''

''اچھا' میرے ساتھ آئیں میں اپنے دوسرے ریستوران میں لیے چلتی ہوں' بہترین کھانا ملے گا۔ اگر تازہ کہیں گے تو لازماً تازہ ہوگا۔''

''تمہیں اردو بولنی آتی ہے؟''

''نو میڈم' میری ماما کو آتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کی ماما کو تو بہت ہی اچھی آتی تھی۔ میری ماما بھی تو یہاں ہی پیدا ہوئی تھی اس لیے اس کی اردو ٹوٹی پھوٹی ہے۔''

وہ ہم دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر جا رہی تھی۔ اس مال میں مختلف دکانوں میں لوگ خریداری کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ جو وہاں پر مقیم تھے۔ وہ بھی اکثر انہی کی رنگت اور چال ڈھال سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس سانولی سی لڑکی کو افریقی سمجھ بیٹھی تھی۔ کافی دور جا کر وہ مال کے دائیں جانب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''اوپر آنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جواب دیا۔

اوپر پہنچتے ہی نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ بہت سے مسلمان مختلف ممالک کے' حجاب میں عورتیں دکھائی دیتی تھیں' غرض کہ بالکل حلال کھانوں کا ریستوران تھا۔ وہاں پر کافی رش تھا اور بے شمار دشوں پر مبنی تھا۔ انڈین کھانے' پاکستانی کھانے۔۔۔۔۔۔۔ غرض کہ لبنانی اور عربی کھانوں کا بھی انتظام تھا۔ ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔ کھانے کی بہت جلدی تھی کیونکہ ڈرائیور نے پورے تین بجے ہوٹل پہنچ کر ہمیں بازار لے کر جانا تھا۔ شاپنگ تو کرنی نہیں تھی صرف ڈاؤن ٹاؤن اور کچھ مقامات دیکھنے تھے۔

وہ لڑکی اپنے سٹال کی طرف جا چکی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اور میں نے آرڈر دے دیا تھا۔ کھانا آنے سے پہلے میری میز کے قریب ایک حجاب والی خاتون بمعہ بچوں کے بیٹھی تھی۔ کھانا ابھی اس کا بھی نہیں آیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''آپ کہاں سے آئی ہیں؟''

''پاکستان سے۔''

''سیر کے لیے آئی ہیں؟''

''سیر ہی سمجھ لیں۔۔۔۔۔۔۔ میرے میاں کانفرنس اٹینڈ کرنے آئے ہیں۔''

''کون سی کانفرنس ہے؟''

''Enviro Law''

''جج ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی، چیف جسٹس آف پاکستان ہیں۔''

''چیف جسٹس۔۔۔۔۔۔!'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔ وہ میرے میاں سے ہم کلام ہوئی۔

''میرے دادا پاکستان میں لائیر تھے۔ مجھے لائیر اور جج کا پروفیشن بہت اچھا لگتا تھا مگر میرے میاں نے لاء ہی نہیں کیا۔ آپ تو ماشاءاللہ چیف جسٹس ہیں، بہت اچھی قسمت ہے آپ کی۔''

''بس اللہ کا کرم ہے ورنہ بندہ کس قابل ہوتا ہے۔'' میرے میاں نے اس کو جواب دیا۔ ریاض پبلک جگہوں پر بڑے کم گو رہتے ہیں۔ میں لوگوں سے بات چیت کر لیتی ہوں، اس مقام کا کلچر جاننا چاہتی ہوں۔

''آپ یہاں رہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، میں یہاں ڈربن میں رہتی ہوں۔ اللہ کا کرم ہے بڑی اچھی زندگی گزر رہی ہے۔''

''آپ کے میاں کیا کرتے ہیں؟''

''یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ کئی سالوں سے ہم یہاں پر سیٹل ہیں۔''

''بڑی سعادت کی بات ہے کہ آپ حجاب لیتی ہیں۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کی بیٹیاں بھی اس آزاد ماحول میں باقاعدہ حجاب سے ہیں۔''

''کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ سب کچھ تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے مگر گھر کا ماحول جیسا ہوگا بچے ویسے ہی پرورش پاتے ہیں۔ میں قرآن میں جو کچھ بھی پڑھتی ہوں وہ رات کے وقت قرآن کا ترجمہ کر کے ان کو زبانی سناتی تھی۔ مجھے ان کو سختی سے کہنا ہی نہیں پڑا کہ تم لوگ حجاب لو، کیونکہ میرے درس سے ہی وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق ڈھل گئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ سارا گھر نمازی پرہیزگار ہے۔''

''میاں بھی نماز پڑھتے ہیں؟''

''جی بالکل، شہر کے اندر جو سب سے بڑی مسجد ہے اس کے قریب ہی ہم لوگ رہتے ہیں۔ کالج سے واپسی پر وہ اکثر مسجد میں نماز

پڑھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اذان بھی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اذان دینے کا بہت ثواب ہے۔"

"یہ تو بڑی سعادت کی بات ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اتنی دور سے آئی ہیں' ہمارے گھر تشریف لائیں' آپ کی ہم تواضع کریں۔"

"جی بہت شکریہ' دن بہت تھوڑے ہیں۔ یہ مصروف بھی ہیں' اس لیے معاف کر دیں۔ زندگی میں پھر کبھی ملاقات ہوئی تو ضرور آئیں گے۔"

وہ تھوڑی سی مایوس ہوگئی تھی۔ اس کے کہنے کے انداز میں محبت' خلوص اور چاہت بھری ہوئی تھی۔ اس طرح بغیر جانے بنا کوئی کیسے جائے۔ میرے دل نے سوچا اور ہم دونوں کی میزوں پر کھانا چن دیا گیا اور وہ بمعہ بچوں کے کھانے میں مشغول ہوگئی تھی۔ اس خاتون کے علاوہ اور بھی کافی خواتین حجاب میں تھیں۔ امریکہ اور لندن کی نسبت یہاں پر کافی مسلمان نظروں کے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ مسکراتے اور آگے بڑھ جاتے۔ جیسے اپنے پاکستانی لوگوں کو دیکھ کر خوشی محسوس کر رہے ہوں۔ کھانے کے اختتام پر میں کیمرہ شاپ کی جانب چل پڑی۔ وہاں پر لوگ باری باری اپنی تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے تصویریں میرے حوالے کیں اور ساٹھ رینڈ مجھ سے فلم کی دھلائی کے لے لیے۔

باہر کے ملکوں میں جہاں بھی جاؤ تو ایک ہی طرز کی دکانیں اور کھانے پینے کے ریستوران ہوتے ہیں۔ ان دکانوں میں کام کرنے والی زیادہ تر خواتین ہوتی ہیں۔ امریکہ لندن میں ان کے ساتھ بول چال کرنے میں دشواری نہیں ہوتی ہے مگر برازیل' چائنہ' پیرس اور خاص کر ساؤتھ افریقہ میں بہت دشواری ہے۔ کہنے کو انگریزی بولتے ہیں مگر انہیں ہماری باتوں کی سمجھ کم آتی ہے۔ کوئی تو بالکل انگریزی نہیں سمجھ پاتے اور کوئی سمجھتے بھی ہیں تو کسی گورے کو بلا لاتے ہیں اور وہ ان کو سمجھاتا ہے۔ وہاں کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر رکی اور پھر اس پلازہ کا نام "ورکشاپ" (Work Shop) تھا جہاں بے شمار دکانیں تھیں۔ زیادہ تر وہاں گروسی کا سامان تھا۔ اتنا بڑا گروسی سیکشن تھا' یوں لگتا تھا کہ سارا ڈربن اس سیکشن میں شاپنگ کرنے آیا ہو۔ بہت بھیڑ تھی۔ ہاتھوں میں ٹوکریاں اور ٹرالیاں تھیں۔ بھر بھر کے چیزیں اس میں ڈال رہے تھے' جیسے تمام گروسی مفت ہو۔ گوشت اور سبزیاں' مچھلی فیروزن اور تازی' ہر چیز دستیاب تھی۔ ہر قسم کی ڈبل روٹیاں' نان' بسکٹ' کوک' جوسز اور ٹولٹری کا سامان' غرض کہ کیا کچھ نہیں تھا۔

سب کچھ اچھا تھا مگر ایک انجانا خوف دامن گیر تھا۔۔۔۔۔۔۔ کہ سیاہ فام یا کوئی اور وہاں کھلم کھلا لوٹ لیتے ہیں۔ ہر چوراہے کے پاس چند لڑکے اس قسم کے نظر آتے ہیں تو دل میں خوف پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ اس ملک میں واردات کا کوئی علاقہ مخصوص نہیں تھا۔

بقول اس خاتون جو جیولری کی دکان میں اتنی حفاظتوں سے بیٹھی تھی' وہاں پر وہ آن گھسے تھے پھر اور علاقوں کا کیا ذکر کرنا۔ وہ ان کا ملک تھا' کھلم کھلا آزادی کے ساتھ وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ دراصل پرانا تعصب ان کے ذہنوں میں تھا جب غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن اب وہ آزاد ہو گئے تھے اور اس آزادی کو اپنے سر پر سوار کر لیا تھا۔ کسی ٹورسٹ کو نہیں چھوڑتے تھے۔

لیکن ان میں اچھے' ذہین اور لائق لوگ بھی ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں' اپنے ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ ہر طرح کے لوگ ہر جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کی ایک اور بھی وجہ ہے جو دہشت گردی پر اترتے ہیں' وہ یہ کہ اس ملک میں بھی غربت ہے۔ یہ بھی تیسری دنیا کے لوگ ہیں۔

اس پلازہ سے واپس پیدل آ رہے تھے کہ راستے میں کوڑے کے ڈبے میں ایک بچہ ہاتھ ڈال کر کھانے پینے کی کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ اور اسی طرح آگے ایک اور بچہ ڈرم میں سے کوئی شے نکال کر کھا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھی ایک کمزور عورت کے ہاتھ پھیلے تھے' وہ مدد کی طلب گار تھی۔ مگر اس نے لوگوں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے خاموشی سے ہاتھ پھیلا لیے تھے۔ اس کو دیکھ کر بہت رحم آیا اور اپنی گداگر عورتیں نظروں کے سامنے گھوم گئیں۔ کھانے کے لیے گاڑی رکتی نہیں تو وہ سر پر سوار ہو جاتی ہیں۔ گود میں بچے اٹھائے نوجوان عورتیں بھیک مانگتی ہیں اور سودا سلف لیتے وقت بھی اطمینان سے کوئی شے نہیں لینے دیتیں۔ نہ کچھ دو تو برا بھلا کہتی ہیں۔ غرض کہ بازار میں کھڑے ہو کر شاپنگ کرنا محال ہو جاتا ہے۔ چاہے تو ملازم بھی کر سکتی ہیں' اگر ان کو نوکری کرنے کے لیے کہو تو صاف انکار کر دیتی ہیں اور کہتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ میرا شوہر پسند نہیں کرتا' یا بچے چھوٹے ہیں' شوہر بھاگ گیا ہے۔

میں نے ایک عورت کو کہا۔

''اچھا چلو' میں تمہارے رہنے کا بندوبست کر دیتی ہوں' تم محنت کرو اور عزت کی روٹی کھاؤ' آؤ میرے ساتھ۔'' اتنا ہی کہا تھا کہ رفو چکر ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہڈحرامی کی عادت ہو گئی ہے۔ ان عورتوں کو بغیر محنت کئے اتنے روپے کما لیتی ہیں تو مزدوری کر کے اتنے روپے کہاں ملتے ہیں۔ ان ہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ہوٹل بلٹن پہنچ گئی۔

وہاں ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے دیوار کے ساتھ لگا ہوا ایک خاموش طبع فقیر گٹار بجاتے ہوئے پایا۔ اپنے قریب اور بھی میوزک کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں آتے ہوئے دیکھا مگر فقیر سے زیادہ مہذب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہم سے کچھ بھی نہ مانگا' مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر ستار دکھائی اور پوچھا۔

''یہ بجاؤں؟''

میرے میاں نے جیب سے کچھ کرنسی نکالی تا کہ اسے دے دی جائے' مگر اس نے ٹھہرا کر ہمیں ستار بجا کر روک لیا۔ بڑی درد ناک دھن تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ افریقہ میں بھی غربت ہے' یہاں پر بسنے والے لوگ پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ محنت ضرور کرتے ہیں۔ وہ کرنسی بغیر ستار سنائے نہیں لے رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ گٹار یا ستار کچھ بھی سناؤں تو تب ان سے روپے وصول کروں۔ یہ بھی ان کی سمجھ کی بات تھی ورنہ کہ جیسے پاکٹ ماروں کا گروپ تھا وہ بغیر محنت کے روپے ہتھیا سکتے تھے۔ لیکن سب افریقی ایسے نہیں تھے۔

حسب معمول ڈرائیور ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آ گیا اور ہمیں ساحل سمندر کی جانب لے جاتے ہوئے گویا ہوا۔

''آپ کو کچھ اور دکھانے سے پہلے سمندر کا نظارہ کروانا چاہتا ہوں سارے شہر میں اس کی خاص خوبصورتی ہے۔''

ڈرائیور کے کہنے کے مطابق ہم نے چلنا تھا۔ کیونکہ پہلی مرتبہ افریقہ آئے تھے۔ ہمیں کوئی خاص علم نہیں تھا کہ شہر کے علاقے کہاں کہاں ہیں۔ سو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ جہاں چاہے پہلے لے جائے۔

گاڑی ساحل سمندر کی جانب بھاگنے لگی۔ یہاں پر جوہانسبرگ کے حساب سے ہر سو ہریالی تھی۔ اتنا گہرا سبزہ وہ بھی خزاں میں ۔۔۔۔۔۔۔ حیرت کی بات تھی۔ راستے میں اونچی اونچی بلڈنگز آنی شروع ہو گئیں۔ پھر سمندر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ صاف ستھری بیچ' چاروں طرف سیاح اپنے اپنے بیگ اور کیمرے پکڑے ساحل سمندر کی طرف پیدل جا رہے تھے۔ یہاں پر گہما گہمی تھی۔ ساحل سمندر پر ریت پر لوگ ستا رہے تھے۔ دوسری طرف کشتیاں اور جہاز کنارے لگے ہوئے تھے۔ ساحل کے پار دور سے بلڈنگز دکھائی دے رہی تھیں۔ بیچ میں لوگ تیراکی بھی کر رہے تھے۔ بیچ کے کنارے بہت سے ہوٹل ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ گو کہ یہ جوہانسبرگ سے چھوٹا شہر تھا۔ مگر اس شہر میں خوبصورتی رونق اور زندگی تھی۔ گاڑی آگے بڑھی تو سرسبز پہاڑ کھڑے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ پہاڑوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اس کے اوپر لوگوں کے رہائشی گھر تھے' خوبصورت گھر ۔۔۔۔۔۔۔ جہاں پہاڑوں کا ویو اور سمندر کا ویو ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ سڑک کے ساتھ ساتھ بھی رہائشی گھر نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ بائیں جانب گھر اور سڑک کے دائیں جانب پام کے درخت گاڑی کے ساتھ بھاگتے دکھائی دیتے تھے۔ شہر واقعی بہت خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ سمندر کا پانی نیلا اور لہریں دودھ کی طرح سفید تھیں۔ کئی میل تک سمندر کا سلسلہ چلتا رہا تو ایک ایسی جگہ آئی جہاں ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ایک بہت ہی سرسبز ایریا میں اس نے گاڑی روک دی۔ ڈرائیور مسلمان تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''آیئے یہاں کی مسجد میں لے

جاتا ہوں۔"

گاڑی اسے اتر کر بہت بڑا صحن پار کر کے مسجد کے قریب پہنچے تو میں حیرت زدہ ہوگئی' نہ صرف یہ کہ مسجد بہت خوبصورت تھی بلکہ اس کے اندر حضرت شاہ غلام محمد حبیب کا مزار بھی تھا جو انڈیا سے ڈربن ۱۸۹۶ء میں آئے تھے۔ اور دریا کے کنارے اپنا ڈیرہ جمایا' گھر بنایا' رہے اور وہیں ان کو دفنا دیا گیا۔ حضرت صوفی صاحب کی تشریف آوری کا ایک مجذوب بادشاہ نے افریقہ کے رہنے والوں کو بتایا تھا کہ قریب ہی وہ زمانہ ہے کہ خدا کا دوست یہاں آئے گا اور اس کے قدم کی برکت سے کفر کا اندھیرا دور ہو جائے گا۔

میں نے اور ریاض نے بڑی عقیدت کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔ صاف ستھرا مزار اور اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد ﷺ کے اسمائے مبارک خوبصورت خط میں دیواروں پر کندہ تھے۔ ایک خادم مسجد میں موجود تھا اس نے ہمارا استقبال خندہ پیشانی سے کیا۔

میں نے بہت سارے لوگوں کو مزار پر چادریں چڑھاتے دیکھا۔ ایک صوفی غلام محمد کا اور دوسرا مزار ان کی والدہ کا تھا۔ مزار کے دائیں جانب بڑا ہی دلفریب منظر تھا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ساتھ بہتا دریا تھا۔ بڑا خوبصورت منظر لگ رہا تھا۔

"اگر کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں تو سجادہ نشین کو بلا کر لاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے خادم چلا گیا۔ مسجد کے سامنے ان کی رہائش گاہ تھی۔

ابھی میں دریا کی جانب دیکھ ہی رہی تھی کہ عربی لباس میں سجادہ نشین تشریف لے آئے۔ چہرہ نورانی' سرخ و سفید۔ انہوں نے ہم سے علیک سلیک کی۔ ریاض کو ہمیشہ سے ہی عقیدت رہی ہے اور مزار کوئی بھی نظر آئے تو فاتحہ اور دعا ضرور پڑھتے ہیں۔ سجادہ نشین بتانے لگے کہ۔۔۔۔۔۔

یہ میرے پردادا کا مزار ہے۔ یوں تو ان کی بہت ساری کرامات ہیں مگر میں آپ کو صرف دو بتا رہا ہوں۔ انڈیا سے پہلی مرتبہ افریقہ جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہوئے تو بمبئی سے روانہ ہونے سے چند روز بعد جہاز میں کثرت سے ہیضہ کی وبا پھیلی۔ جہاز کے مسافروں میں بھی سخت اضطراب پھیل گیا۔ جہاز میں ایک ایسا شخص سوار تھا جو ان کی کرشمہ سازیوں سے واقف تھا۔ اس نے التجا بھری آواز سے کہا۔

"صوفی صاحب تمام جہاز مبتلائے ہیضہ ہے' خدا سے دعا کیجئے' کرم ہو جائے۔"

انہوں نے پانی دم کر کے دیا اور لوگوں کو افاقہ ہو گیا تھا۔

دوسری کرامت یہ ہے کہ جس وقت ناٹال پہنچے تو مندر کے قریب ایک غیر آباد علاقے پر قیام فرمایا (جہاں اس وقت آپ کا مزار

ہے) اس کے قریب ہی ایک مندر تھا۔ اس مندر کے مقابل ایک بہت بڑا پتھر پڑا ہوا تھا جس کے نیچے ایک قوی ہیکل اژدہا رہتا تھا۔ وہاں کے لوگ اس سے تنگ آ گئے تھے۔ اس کو نکالنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا مندر میں لوگوں نے آنا بند کر دیا تو مندر کے پجاری نے صوفی صاحب کو رونق افروز دیکھا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دست بستہ مندر کی ویرانی اور اژدہا کی موجودگی کا بتایا اور کہا کہ اس کے شر سے نجات دلائی جائے۔ پجاری کے حال زار پر انہیں رحم آیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی اس مقام پر پہنچے اور کہا۔ ''بھائی تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ یہاں خواجہ غریب نواز کا جھنڈا گڑنے والا ہے۔ ان کی صدا سنتے ہی اژدہا وہاں سے نکلا اور سیدھا دریا کی طرف رخ کئے ہوئے چلا گیا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر لوگ حیران ہو گئے۔ پجاری نے جو یہ دیکھا تو اس نے وہ تمام زمین اور مندر کا مکان حضرت کے ہاتھ بیچ ڈالا اور خود چلا گیا۔ حضرت صوفی شاہ نے مندر کی جگہ مسجد قائم کی اور اس کے قریب مدرسہ اور خانقاہ اور مسافر خانہ بنوایا۔''

یہ بتا کر وہ اصرار کرنے لگے کہ میرے گھر تشریف لائیں۔

سو ہم ان کے گھر جو بالکل مزار کے سامنے تھا ان کے ہمراہ چلے گئے۔ وہاں پر ان کی اہلیہ عربی چوغے میں تھیں۔ بہت ساری خواتین کچن میں دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ تمام اشیاء فریج' ٹی وی' غرض کہ صاف ستھرا مکان ہر ضرورت کی چیز وہاں نظر آ رہی تھی۔ پردادا کے زمانے میں سادگی ہو گی مگر زمانہ ترقی کر چکا تھا۔ مولانا صاحب قدرے ماڈرن ہو گئے تھے۔ پھر میرے میاں کی عقیدت دیکھ کر بتانے لگے۔۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ آئیں میں ان کا سامان دکھاتا ہوں۔ گھر سے باہر نکل کر مزار سے پہلے بائیں ہاتھ ایک کمرے کا تالا کھول کر وہ کمرے کے اندر داخل ہوئے اور ہمیں بھی آنے کے لیے کہا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو دیواروں کے اندر داخل ہوئے اور ہمیں بھی آنے کے لیے کہا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو دیواروں کے ساتھ شیشے کے شوکیسوں میں صوفی غلام محمد حبیب شاہ کی تمام چیزیں جوں کی توں رکھی ہوئے تھیں۔ ان کا تکیہ جو کہ بوسیدہ حالت میں تھا۔ برتن' بستر اور دیگر چھوٹی چھوٹی گھر کے استعمال کی چیزیں بڑی حفاظت کے ساتھ اس کمرے میں محفوظ تھیں اور خاص کر کے ان کے ہاتھ کا لکھا قرآن مجید تھا۔ ان کی وفات کو کتنا عرصہ ہو گیا تھا مگر ان کے عقیدت مند آتے' منتیں مانتے اور چادریں چڑھاتے۔ سجادہ نشین صوفی صاحب کے پوتے کے بیٹے تھے۔ اور اس مسجد اور مزار کی نگرانی انہی کے ذمہ تھی۔ سو ہر مسلمان بہن بھائی کے ساتھ ان کی خاص عقیدت تھی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو وہ بے حد محظوظ ہوئے اور کہنے لگے۔

''آپ کی حاضری یہاں منظور تھی' ورنہ آپ کو خبر ہی نہیں ہونی تھی کہ یہاں ہمارے آباء واجداد کی مزاریں ہیں۔ صوفی صاحب کو

ضرور آپ کی آمد کی خبر ہوگئی تھی۔اس لیے انہوں نے اپنے مزار پر آپ کو بلا لیا ہے۔''

یہ بات ان کی بجا تھی کیونکہ ہم Gate Way شاپنگ مال کی طرف جا رہے تھے۔راستے میں ڈرائیور کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے گاڑی یہاں روک دی تھی۔ ریاض کی نظر سبز گنبد کی طرف پڑی تو انہوں نے ڈرائیور کو گاڑی سے اترنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور کا ارادہ ہوتا تو چلتے وقت ضرور کہتا مگر یہ تو ہمارا بلاوا تھا ورنہ چلتے وقت اس نے ہمیں نہیں کہا کہ میں آپ کو صوفی صاحب کے مزار پر لے کر جا رہا ہوں۔

اگنی میں حضرت صوفی غلام محمد شاہ نے جو مسجد تعمیر کی تھی اس کے حوض کے متعلق چند بدعقیدہ مخالفین نے اعتراض کیا کہ یہ حوض شرعی نہیں ہے یعنی درست نہیں۔ یہ بات صوفی صاحب تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا بھائی فضول گوئی سے فائدہ۔۔۔۔۔۔۔ان سے کہو کہ اپنے ہاتھ سے ناپ کر حوض کی نسبت رائے قائم کریں۔اس پر مخالفین نے ضد اور حسد کی وجہ سے ناپنا شروع کیا مگر کوئی یہ نہ بتا سکا کہ کتنا چھوٹا اور کتنا بڑا ہے۔ کیونکہ ہر مرتبہ ناپ میں غلطی ہوتی گئی۔ اس پر بہت پشیمان ہوئے اور اپنی حرکت ناشائستہ سے باز آ گئے۔

اس مسجد کے علاوہ ساحل سمندر کے قریب ایک اور مسجد ہے جو افریقہ کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ نہ صرف وہاں پاکستانی ہیں بلکہ بہت سے مسلمان جن میں افریقی بھی شامل ہیں' باقاعدہ اذان کی آواز گونجتی ہے۔لوگ نماز کے لیے جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ ورنہ تو غیر ممالک میں اذان کی آواز سننے کے لیے کان ترس جاتے ہیں۔ساؤتھ افریقہ میں ایسا نہیں ہے۔ ہر ریستوران میں حلال گوشت دستیاب ہوتا ہے۔ میری سوچوں کا دائرہ گھومتے گھومتے نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مسجد سے کوچ کر کے گیٹ وے شاپنگ مال کی جانب جا رہے تھے۔ یہ ڈربن کا سب سے بڑا شاپنگ مال تھا' جو ہوٹل سے آدھے پونے گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ سارا راستہ پام کے درختوں اور سبزے کو دیکھتے گزرا تھا اس کے ساتھ ساتھ ساحل سمندر بھی اور اس کی تیزی سے اٹھتی لہریں بھی ہماری توجہ کا مرکز بنتی رہی تھیں۔

گیٹ وے پلازہ آ گیا تھا۔ڈرائیو وے پر گاڑی پارک کرتے وقت ڈرائیور نے کہا۔

''آپ اس دروازے کو اچھی طرح سے دیکھ لیں' میں اسی جگہ پر ٹھیک دو گھنٹوں کے بعد آ کر لے جاؤں گا۔ یہ گیٹ وے پلازہ کی مین انٹرینس ہے۔''

باہر کے ملکوں کے مالوں میں پھر پھر کر تجربہ ہو گیا تھا کہ کہاں پر اترنا ہے اور کہاں واپس جانا ہے۔ لہٰذا پوائنٹ یاد کر کے میں اور

ریاض دونوں شاپنگ مال میں داخل ہو گئے تو اندر جا کر بالکل باہر کے ممالک کی طرح خوبصورت مال میرے سامنے تھی۔

اس مال میں خاصی گہما گہمی تھی۔ لوگ خریداری میں مصروف تھے۔ یہ کوئی سستا شاپنگ سنٹر نہیں تھا بلکہ اس کو ڈربن کا مہنگا ترین مال کہہ سکتے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ لگتی تھی کہ افریقی عورتیں سیاہ فام اور ان کے لباس بھی عجیب وغریب تھے۔ مگر دکانوں پر چیزیں بہت عمدہ تھیں۔ کبھی کبھی تو نوجوان لڑکوں کو دیکھ کر میں بھول جاتی تھی کہ افریقہ میں ہوں۔ یوں معلوم ہونے لگتا تھا جیسے کسی جنگل کے حصے میں آ گئی ہوں۔ مگر دکانوں کی تیز روشنیاں اور خوبصورت عمارتیں میرا دھیان اپنی طرف کر لیتی تھیں۔ ہر جگہ جانوروں کی تصویریں اور سٹیچوز دیکھنے کو ملتے تھے۔ ہاتھی' شیر تو جا بجا دکھائی دیتے تھے۔ مہذب ہونے سے پہلے یہی افریقی جنگلوں میں بسیرا کئے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ جب مہذب ہوئے تو انہوں نے اپنی روایت کو قائم رکھا' جانوروں سے پریت لگائی' ان کی یادوں کو تازہ کیا۔ سوسجاوٹ کی چیزیں بھی جانوروں کے روپ میں ملتی ہیں۔ خوبصورت ماربل کی' کرسٹل کی اور لکڑی کی چیزیں سب کی سب جانوروں کی شکل میں تھیں۔ ہاتھی تو خاص ان کا من پسند جانور ہے۔ ان کی ٹی شرٹ پر بھی ہاتھی یا شیر کی تصویر بنی ہوئی نظر آئے گی۔

غرض کہ مال میں خاصی گہما گہمی تھی۔ ضرورت کی ہر شے بڑی نفاست اور کرینے سے شوکیسوں میں نظر آتی تھی۔ جوتے' اونی ملبوسات اور مردانہ کپڑے' مردانہ جوتے اور اس کے علاوہ سویٹر کی دکانیں تھیں مگر بے انتہا مہنگی تھیں۔ کوئی شے ایسی نہیں تھی جسے سستا کہا جائے۔

آبشار کا پانی مسلسل گر رہا تھا۔ سامنے نظر پڑی تو ایکسی لیٹر سے پرے ایک شخص رسے کی مدد سے چڑھ کر اس مال کی چھت پر پہنچ گیا تھا۔ نیچے کھڑے لوگ شاپنگ کرتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ میں بھی بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شعبدہ گر اپنے کرتب دکھا کر خلا میں الٹ بازیاں لگا کر رسے کو پکڑ کر کرتب دکھانے میں مصروف تھا۔ صرف پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے ایسا خطرناک کام کر رہا تھا۔ اس کی کمائی بھی حق حلال کی تھی۔ محنت سے لوگوں کا جی بہلا رہا تھا۔ بہت سی مائیں شاپنگ مال کے درمیان کھڑے ہو کر بچوں کو اس کے کرتب دکھا رہی تھیں۔ روزی کمانے کے لیے وہ اپنی جان کی بازی لگا کر رسے کے ذریعے چھت پر چڑھا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میں دوسری سمت دکانوں کی جانب چل پڑی۔ مال میں نیچرل پلانٹ اور پھولوں کی بہت ساری دکانیں تھیں۔ اور ایک ایسی پھولوں کی دکان جہاں بڑے ہی خوبصورت پلانٹ شوکیسوں میں نظر آ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اصلی پھولوں کو شاید شو کیسوں میں بند کیا ہوا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دکان کے اندر چلی گئی تھی۔ یہاں پر بھی ہندو سیل گرل کھڑی تھی۔ ماتھے پر بندیا لگائے ہوئے تھی۔ میں نے پوچھا۔

''یہ اصلی پام کے پودے ہیں؟'' میری بات سن کر مسکرائی اور جواب دیتے ہوئے بتانے لگی۔

''میڈم! یہ اصلی نہیں ہیں' نقلی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ مگر ان پر ضرورت سے زیادہ محنت کی گئی ہے تاکہ یہ پلانٹ اصلی معلوم ہوں۔''

دکان میں پھول ہی پھول تھے' جو سب کے سب اصلی معلوم ہو رہے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''سب نقلی پھول ہیں؟''

''جی''

''کہاں کے ہیں؟''

''یہ خاص ساؤتھ افریقہ میں تیار ہوئے ہیں۔''

اس کی بات سن کر میں دوسرے شوکیس میں ساؤتھ افریقہ کی چیزیں جو موتیوں میں بنی ہوئی تھیں' ان میں گلاس' پلیٹیں اور گلاسوں کے نیچے رکھنے والے کوسٹر بھی تھے۔ بڑی نفیس اور عمدہ چیزیں تھیں۔

''یہ دکان آپ کی ہے؟''

''نہیں میڈم' میں یہاں پر سیل گرل ہوں۔'' میں نے دیکھا' کافی مہذب لڑکی تھی۔

''یہاں انڈیا سے آئے ہیں؟''

''جی' بہت سال پہلے میرے پردادا آئے تھے۔ میں نے تو انڈیا دیکھا ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ آپ بھی انڈیا سے ہیں؟''

''نہیں' پاکستان سے۔''

''اچھا' انڈیا کا پارٹ ہے۔'' بڑی شستہ انگریزی بول رہی تھی۔

''کتنے گھنٹے کام کرتی ہو؟''

''میں صرف شام کو آتی ہوں۔ صبح کے وقت کالج جاتی ہوں۔ پڑھائی کا خرچہ پورا کرنے کے لیے جاب کرتی ہوں۔''

میں نے سوچا۔ ''یہ لوگ بھی بالکل ان لوگوں کی طرح اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ پاکستان میں سوائے غریب گھرانوں کے کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے اپنا خرچہ والدین کے ذمے ڈال کر عیاشی سے پڑھتے ہیں۔''

وہ لڑکی لباس سے اچھے کھاتے پیتے گھر کی لگ رہی تھی مگر افریقہ کے طور طریقوں کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ایک شخص کماتا ہے اور دس لوگ اس کی کمائی سے کھاتے ہیں۔

میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

''والدین کیا کرتے ہیں' میرا مطلب ہے ماں باپ کہیں ملازم ہیں؟''

''ماما تو گھر داری کرتی ہیں' میرے پاپا ڈاکٹر ہیں۔''

''ڈاکٹر تو خاصے رئیس ہوتے ہیں' خاص کر کے باہر کے ملکوں میں۔۔۔۔۔۔۔ پھر تم سروس کیوں کرتی ہو؟''

''پاپا کماتے ضرور ہیں اور ہم خوشحال بھی ہیں مگر میری دو بہنیں اور بھی ہیں۔ ہم تینوں کی شادیاں بھی ہونی ہیں۔ آپ تو پاکستانی ہیں' معلوم ہی ہے کہ شادی پر کتنا خرچہ ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو جہیز دینا پڑتا ہے۔''

''یہاں افریقہ میں بھی؟'' میں حیران تھی۔ وہ وہی جملے دہرانے لگی۔

''جی آپ تو جانتی ہیں کہ ہمارے رسم و رواج کتنے ہیں۔ ہمیں بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ لڑکے والے ڈیمانڈ کرتے ہیں۔''

''لیکن اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔''

''زمانہ تو بدل گیا ہے مگر ہم لوگوں کی رسمیں نہیں بدلی ہیں۔ گو کہ لڑکے کے والدین بھی انڈیا سے افریقہ آئے ہیں مگر ابھی تک اپنے رواجوں پر قائم ہیں۔''

وہ تھوڑی سی افسردہ ہو گئی تھی۔ زمانہ بدل گیا تھا اور باہر کی دنیا میں رہتے ہوئے لوگوں کے خیالات بدل گئے تھے۔ مگر بھارتی ابھی تک اپنے رواجوں پر قائم تھے۔ لڑکی تھوڑی سی جذباتی ہو گئی تھی اور میں دکان سے باہر آ گئی تھی۔

E. Enviro Law 2002 کانفرنس ہلٹن ہوٹل کے بالکل سامنے بلڈنگ پر ہو رہی تھی۔ اس کی جانب ناشتہ کے بعد چل پڑی تھی۔ میرے میاں نو بجے سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت اس کا دوسرا سیشن چلنے والا تھا۔ بہت بڑی بلڈنگ' کئی راہداریاں اور ایکسی لیٹر عبور کرتے ہوئے میں بہت بڑی کوریڈور پر پہنچی تو وہاں بہت ساری تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ ملکہ الزبتھ جب افریقہ آئیں تو وہاں کے پریزیڈنٹ Thambo Meri کے ساتھ تھی۔ یہ بہت بڑی تصویر تھیں۔ دوسری تصویر بھی ملکہ کی تھی۔ کومن ویلتھ گورنمنٹ پریزیڈنٹ کے ساتھ ان کے ہمراہ کافی لوگ تھے۔ ایک تصویر میں ملکہ تقریر کرتے ہوئے مائیک نے آگے کھڑی تھیں بہت سے لوگ یہاں بھی ان کی تقریر سن رہے تھے۔

مسٹر نیلسن' پریزیڈنٹ آف ساؤتھ افریقہ کی تصویر اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر فائز آفیسروں کی تصویریں نمایاں طور پر تھیں۔ پرنس

آف ویل Vale اوران کی اہلیہ کی فوٹو بھی دیکھنے کو ملی اور ڈربن کے بشپ Desmond Tutu کی تصویر تقریر کرتے ہوئے اور ڈاکٹر رندھیر کمار مسٹر آف انڈیا Dr. N. Ram Goolam' یا سر عرفات تقریر کرتے ہوئے تصویر پر نظر آئے۔ کوفی عنان سیکرٹری جنرل XII ڈربن کی تصویر لگی تھی اور مختلف کپڑوں کے ٹکڑوں کو کاٹ کر فریم میں لگا کر افریقہ کے کلچر کو دکھایا ہوا تھا۔ ایک شو کیس میں جو شیشے کا تھا وہاں ایک پولیس آفیسر کی ٹوپی رکھی ہوئی تھی جہاں شوکیس کے باہر لکھا ہوا تھا' Humber _____ Side یہ مسٹر جون سینڈر John جو چیئرمین ICC بورڈ آف ڈرائیلرز تھا۔۔۔۔۔۔۔ یہ ٹوپی نمایاں طور پر تصویروں سے پہلے لگائی ہوئی تھی۔

ان تصویروں کو دیکھ کر آگے بڑھی تو کانفرنس کا پہلا سیشن ختم ہو چکا تھا۔ ہال کے باہر کافی اور چائے کے سٹال لگے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سموسے اور بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ تمام ملکوں سے آئے ہوئے لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اپنے اپنے ناموں کے کارڈ گلے میں ڈالے ہوئے تھے' کوئی پرابلم نہیں ہو رہی تھی کہ کوئی کس ملک کا ہے۔ چائے پیتے ہوئے جوہانسبرگ سے آئی ہوئی لائر مجھ سے بات چیت کرنے لگی۔

وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ پاکستان کیسا ملک ہے اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں گفتگو کرنے لگی تھی۔

''وہاں پر سنا ہے کہ مرد بہت تشدد کرتے ہیں' کوئی زندگی نہیں ہے خواتین کی۔''

''عورتوں کو بہت سے حقوق ملے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے جتنے بڑے بڑے شعبے ہیں وہاں پر پاکستانی عورت دکھائی دے گی۔ رہی تشدد کی بات تو دیہی علاقوں میں عورتوں کے ساتھ تشدد ہوتا ہے کیونکہ تعلیم کی کمی ہے۔ اب آہستہ آہستہ وہاں بھی لوگوں کو شعور آتا جا رہا ہے۔ جتنے بھی کسانوں کے بچے ہیں' ان کے والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ بچے پڑھ لکھ کر کسی اچھے عہدوں پر فائز ہوں۔ پاکستانی مرد ابھی بھی ڈومینیٹنگ ہیں۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں آپ چلی جائیں' تو مرد ہمیشہ ایک سا۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کی فطرت میں رعب و دبدبہ ہوتا ہے۔ آپ کے ملک میں کیوں طلاقوں کی شرح زیادہ ہے' اسی لیے کہ وہ مرد کا غصہ برداشت نہیں کر سکتیں اور طلاق ہو جاتی ہے۔''

وہ مسکرائی۔

''ٹھیک ہے' طلاق ہو جاتی ہے' مرد کی بے وفائی سے' اس کے برے سلوک سے مگر عورت کے حقوق کتنے ہیں۔ میں تو کہوں گی کہ باہر کی دنیا میں عورت کا راج ہے۔ اب مجھے دیکھیں' میری شادی ہوئی' میری اس سے بن نہ سکی' تو میں اس کی نوک ٹوک سے تنگ آ گئی

تھی لہٰذا کچھ عرصہ رہی اور میں نے طلاق لے لی۔۔۔۔۔۔۔اب میں جوہانسبرگ میں رہتی ہوں۔''

''آپ کے والدین ساتھ رہتے ہوں گے۔''

''وہ تو نیویارک میں رہتے ہیں۔میں یہاں پر پریکٹس کرتی ہوں' اکیلی رہتی ہوں' زندگی پرسکون طریقے سے گزر رہی ہے۔'' وہ مسکراہٹیں بکھیرتی مجھ سے گفتگو کر رہی تھی۔میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن اکیلا انسان کیسے پرسکون رہ سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔۔بچوں کا غم' ان کے پرابلمز اور ان کے اخراجات وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔شادی کر کے میں نے دیکھ لیا ہے کہ سکھ نہیں ملتا۔''

''لہٰذا شادی کا ارادہ نہیں رکھتیں۔''

''سوچوں گی۔۔۔۔۔۔۔اگر آئیڈیل مل گیا تو فوراً کرلوں گی۔''

''آئیڈیل صرف کتابوں اور خوابوں میں ملتے ہیں۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔

''آپ کا قیاس غلط ہے' حقیقت میں بھی مل جاتے ہیں' ڈھونڈنے کی بات ہے۔''

''خدا کرے آپ کو اپنا آئیڈیل مل جائے۔''

''نہ ملا تو کوئی بات نہیں میں ویسے ہی بے غم اور خوش ہوں۔''

اس سے بات چیت کرنے کے بعد میں آگے بڑھی تو لائرلڑکی جو کینیڈا سے آئی ہوئی تھی بمعہ اپنے شوہر کے خندہ پیشانی سے ملی اور بتانے لگی۔

''میرا ہنی مون اس کانفرنس کی نظر ہو گیا ہے۔'' نئی نئی شادی ہوئی تھی۔اپنے شوہر کے ساتھ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ابھی گھر داری کا چکر اس نے نہیں دیکھا تھا۔شوہر اس وقت اس کے لیے چاند اور ستارے بھی توڑ کر لا سکتا تھا۔اس کی ہر بات مان رہا تھا۔میں مسکراتی ہوئی ایسے گروپ میں پہنچ گئی جہاں بہت سارے چیف جسٹسوں کے درمیان میرے میاں کھڑے تھے۔میرا تعارف ہوا۔ ایک نے مجھ سے پوچھا۔''آپ بھی اس شعبے میں تعلق رکھتی ہیں' میں نے آپ کو نوٹس بناتے دیکھا ہے۔''

ریاض نے جواب دیا۔''یہ رائٹر ہے' سفرنامہ کے نوٹس بنا رہی ہے۔''

رائٹر کے نام سے وہ محظوظ ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''واقعی ہی آپ کا بہت اچھا شوق ہے۔ آپ کانفرنس بھی اٹینڈ کرتی ہیں۔ اکثر پاکستانی اور انڈیا کی خواتین شوق نہیں رکھتیں۔ لکھنے کے لیے کانفرنس اٹینڈ کرنا ضروری ہے ورنہ آپ کیا لکھیں گی۔''

''یہ تو ہے۔'' ٹی بریک ختم ہو چکا تھا۔ کانفرنس ہال میں سب جج صاحبان اور وکلاء چلے گئے تھے۔

یہ بہت بڑا ہال تھا' جہاں سب سے آگے سٹیج اور دائیں اور بائیں بڑی بڑی سکرین لگی تھی تا کہ اسٹیج پر بیٹھنے والے جب تقریریں کریں تو پیچھے بیٹھنے والے آسانی سے دیکھ سکیں۔ جا بجا سپیکر لگے تھے سب نشستوں پر ججز' لائرز' اور ایک طرف صحافی بیٹھے تھے۔ سٹیج کو پھولوں سے آراستہ کیا ہوا تھا۔۔ سٹیج کے نیچے دائیں اور بائیں جانب تمام ملکوں کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ یہ جن جن ملکوں سے چیف جسٹس آئے تھے ان ملکوں کے جھنڈے تھے۔

سٹیج پر امریکن سپریم کورٹ کے جج کچھ خواتین اور ساؤتھ ایشیا کا منسٹر براجمان تھا۔ تقریریں ہو رہی تھیں۔ واقعی وہاں عورت کا راج دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ عورتوں کو تقریریں کرتے ہوئے میں نے دیکھا تھا وہ مردوں سے کسی صورت بھی پیچھے نہیں تھیں۔ ان کی تقریروں میں وزن' ٹھہراؤ اور ٹھوس دلائل تھے۔ افریقہ میں بھی عورتوں کے بہت سے حقوق تھے۔ یہ تقریریں E. Envior لاء پر ہو رہی تھیں۔ ہال کے آخر میں چھوٹے چھوٹے کیبن تھے وہاں پر ترجمہ کرنے والے اشخاص مختلف زبانوں میں ترجمہ کر رہے تھے۔ فرنچ' انگریزی' جرمن اور کئی زبانیں اور تھیں۔ صرف اردو میں ترجمہ نہیں تھا۔ وہ ملک بھی تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والا تھا۔ مگر افریقہ نے ہر لحاظ سے بہت ترقی کی ہے۔ جہاں سیاہ فام کے لیے اتنا تعصب تھا اب سیاہ فام زیادہ اور گورے کم دکھائی دے رہے تھے۔ گانے بھی عشائیہ کے دوران ہر سیاہ فام عورت کے ساتھ ایک گورا مرد اور گورے مرد کے ساتھ سیاہ فام خاتون شامل تھی یعنی وہ ہنسی خوشی ان کے ساتھ مکس ہو گئے تھے۔ یہاں افریقہ میں سیاہ فام کا زیادہ راج تھا۔ کیوں نہ ہوتا' ان کو آزادی ملی تھی۔ ان کا ملک تھا۔

اس کانفرنس میں ۵۵ ممالک کے چیف جسٹس صاحبان اور کئی سپریم کورٹ کے جج اور وکلاء شامل تھے۔ ہال میں بڑے زور و شور سے بحث ہو رہی تھی۔ اپنے اپنے ملک کی ماحولیاتی فضا کے بارے میں گفت و شنید کر رہے تھے۔

ڈربن کی کانفرنس میں قانون سازی پر بہت دور رس گفتگو کی گئی اور پاکستان کے چیف جسٹس شیخ ریاض احمد نے دیگر قوانین کے علاوہ ۱۹۹۷ء کے قانون کا ذکر کیا جس میں ہر قسم کی آلودگی سے نمٹنے اور ختم کرنے کے لیے قانونی شقوں کا ذکر کیا۔ اور جب وہ بتا رہے تھے تو پاکستان کے قانون کو سب نے سراہا اور چیف جسٹس آف پاکستان نے یہ بھی بتایا کہ ماحولیات کی ایک علیحدہ ڈویژن بنا

دی گئی ہے اور ایک کونسل بھی' جو ایک وزیر کے تحت کام کرتی ہے اور اسی قانون کے تحت ووٹر میونسپل بھی تشکیل دیئے گئے ہیں جو کہ مقدمات سنیں گے اور ضروری احکامات جاری کریں گے اور سزا بھی دے سکتے ہیں۔ ماحول کی پراگندگی کو جرم تصور کیا گیا ہے۔

چیف جسٹس نے یہ بھی بتایا کہ بلوچستان میں زیارت کے علاقہ میں صنوبر کے جنگلات کاٹنے پر کڑی پابندی لگائی گئی ہے اور لوگوں کے لیے گیس کے سلنڈروں کی سپلائی اور اس کی ترسیل کی گئی ہے تاکہ لوگ صنوبر کے جنگل کو ایندھن کے طور پر استعمال نہ کریں۔ یہ کانفرنس نہایت ہی کامیاب رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ دنیا کے تمام ممالک اس مسئلہ کی سنگینی کو سمجھ رہے تھے اس کا احساس ان کو ایسے اقدامات کرنے پر مجبور کر رہا ہے جس سے انسان کی زندگی بچے ۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ صحیح طور پر قدرت کے عطیات سے بھرپور افادہ حاصل کر سکیں۔ صاف پینے کے پانی کی اہمیت پر بھی بہت زور دیا گیا اور یہ عہد کیا گیا کہ غربت کا خاتمہ بھی ہو۔ پاکستان میں اس سمت یعنی غربت یعنی ختم کرنے کے احکامات کا بھی کانفرنس میں ذکر کیا گیا تھا۔

کانفرنس میں بحث چل رہی تھی۔ میں چپکے سے باہر راہداری میں آئی تو بہت ساری کتابیں سٹال پر لگی تھیں۔ خاص کر کے افریقن کلچر اور اس کی تمام ہسٹری' منڈوبین کی دلچسپی کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ باہر کھڑی ہی تھی کہ ملائشیا کے چیف جسٹس کی اہلیہ ان رسالوں کی ورک گردانی کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

''آپ کہاں سے حلال کھانا کھاتی ہیں؟''

''مختلف ہوٹل پاکستانیوں اور انڈینز کے ہیں' وہاں سے ۔۔۔۔۔۔ یا ہوٹل سے فش کھا لیتے ہیں۔''

''اوہ ۔۔۔۔۔۔ پھر تو بہت اچھا ہے' آپ کو حلال کھانے کے لیے مشکل نہیں پڑتی۔''

انہوں نے میز سے وائن کی بوتل اٹھائی اور مجھ سے پوچھا۔

''آپ پئیں گی؟''

''نہیں'' میں گھبراہٹ میں صرف ''نہیں'' پر اکتفا کر سکی۔ وہ کہنے لگیں۔

''ریڈ وائن خواتین کے لیے بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس میں انسان کے دل کی شریانیں کھلی رہتی ہیں۔''

''لیکن معاف کیجئے' میں پیتی نہیں ہوں ۔۔۔۔۔۔ اور ویسے بھی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔''

وہ ہنسی اور کھل کر قہقہہ لگاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''یہ میڈیسن ہے ۔۔۔۔۔۔ ٹانک حرام کیسے ہوا؟''

میں اس کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے دھیرے سے جواب دیا۔ ''یہ سوچ کی اور ہمارے اسلامی نقطہ نظر کی بات ہے۔ اسلام میں جائز نہیں۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔ پھر میں آپ کو فورس نہیں کروں گی۔'' اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

گلاس میں وائن ڈالی اور کافی کے میز پر بوتل رکھ دی۔ جہاں بسکٹ' چائے' کافی اور ریڈ شیمپین رکھی تھی۔ ایک لحاظ سے باہر کی دنیا میں بسنے والے لوگ اگر پیتے ہیں تو دوسروں کو مجبور نہیں کرتے اور نہ ہی ان کو بار بار کہہ کر زبردستی پلاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے لوگ اگر بے چارے نہ بھی پیتے ہوں تو ان کے ساتھی' ان کو مجبور کر کر کے پلاتے ہیں اور وہ شخص بے بس ہو کر پینے لگ جاتا ہے۔''

رات کو کھانا کھانے کے لیے جب ہلٹن سے نکلے تو شاپنگ پلازہ بند تھا وہاں پر پاکستانی کھانے کا ریستوران تھا۔ پلازہ کے باہر ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس سے رجوع کیا تو اس نے بتایا۔ ہوٹل ہولی ڈے ان کے اندر انڈین ریسٹورنٹ ہے وہاں حلال کھانا آپ کو مل جائے گا۔ اس کے کہنے کے مطابق ہم ٹیکسی پر بیٹھ گئے۔ ڈاؤن ٹاؤن کی روشنیوں میں شہر خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ دور سے سمندر کی اٹھتی ہوئی لہریں تیز روشنیوں کی وجہ سے خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگ بیچ پر بیٹھے ان لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

پانچ یا سات منٹ کی ڈرائیو پر ہولی ڈے ان آ گیا تھا۔ پندرہ رینڈ لے کر ٹیکسی والا چلا گیا تھا۔ یہ بھی ایک کالج میں پڑھتا تھا۔ اپنے کالج کی فیس پوری کرنے کے لیے وہ پارٹ ٹائم یہ ٹیکسی چلاتا تھا۔ ہوٹل کے اندر داخل ہو کر پاکستانی ریستوران کا ریسپشن سے پوچھا تو وہاں پر ایک کالی اور اس کے ساتھ ہی ایک گوری لڑکی کھڑی تھی۔

''دائیں جانب'' اشارہ کرتے ہوئے اس نے ہمیں بتایا۔

دائیں جانب چند قدم کے فاصلے پر انڈین ریستوران تھا۔ ایک ہندی لڑکی اور ایک مسلمان مرد نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ ہندو اور پاکستانی مل کر اس ریستوران کو چلا رہے تھے۔ لڑکی نے بندیا لگائی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''فکر نہ کریں' یہاں پر سب کھانا حلال ہے۔'' میں حیران سی اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ میں نے تو ابھی پوچھا ہی نہیں۔ مینو کارڈ ہمارے سامنے رکھ گئی تھی۔ انڈین پاپڑ بطور ایس ٹائنرز کے ٹیبل کے اوپر رکھتے ہوئے بولی۔

''یہاں پر پاکستانی اور بھارتی دونوں کھانے ساتھ ساتھ مل سکتے ہیں۔''

بھارتی انداز سے کڑاہی گوشت منگوایا اور دل مسور کی' منسروم مٹر۔۔۔۔۔۔۔ لیکن جب کھانا سامنے آیا تو اس کا ٹیسٹ مجھے

بہت فرق لگا تھا۔ پردیس کا معاملہ تھا میں اپنے میاں کو یہ نہ کہہ سکی کہ کھانا صحیح نہیں ہے۔ بس دال اور روٹی پر اکتفا کر کے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ بل جب آیا تو وہ باقی ریستوران کے مقابلے میں زیادہ تھا۔

واپس ہلٹن ہوٹل جانے کے لیے جب ریسیپشن سے پوچھا تو لڑکی کالی نے بتایا۔

''آپ کو ٹیکسی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے پیچھے جو سڑک ہے وہ سیدھی ہلٹن کی جانب جاتی ہے' صرف دس منٹ کی واک ہے۔''

میں ریاض کے ساتھ ڈاؤن ٹاؤن کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ راستے میں گٹار پر ساز بجاتے ہوئے عمارتوں کی دیوار کے ساتھ لگے فقیر کھڑے تھے۔ وہ اپنی دھن میں گٹار بجا رہے تھے۔ ان کے قریب فرش پر کپڑا بچھا تھا۔ لوگ آتے جاتے اس پر چند سکے ڈال رہے تھے۔ یہاں پر بھی گداگر بڑی نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ بھیک مانگ رہے تھے۔ گو کہ وہ بھیک مانگ رہے تھے مگر لوگوں کو ذرہ بھر تنگ نہیں کر رہے تھے۔ یہاں اپنے ملک کے فقیروں سے جان چھڑانا بڑا دل گردے کا کام ہے۔ اس وقت میڈیسن اور گورسری سٹور کھلے تھے۔ لوگوں کا ہجوم گروسی سٹوروں میں نظر آ رہا تھا۔ جب گوری کر کے باہر نکلتے تو دیوار کے ساتھ لگے فقیروں کو دیکھتے ہوئے کچھ دیتے یا نہیں بھی' مگر وہ ان کے پیچھے نہیں بھاگتے تھے۔ نہ ان کے بچوں کا واسطہ دیتے تھے بس گٹار اپنی دھن میں بجا رہے تھے۔ یہ فقیر مجھے کچھ مہذب دکھائی دینے لگے تھے۔

میں گاہے بگاہے ایسے فقیروں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ اصرار نہیں کر رہے تھے۔ اور نہ ہی کہتے تھے کہ گھر میں والدہ بیمار ہے' بہن کا آپریشن کروانا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ ان کو دیکھ کر میں یہ بھی اخذ کرنے لگی تھی۔ شاید یہ ویسے ہی شوقیہ گٹار بجا رہے ہوں۔ ان کا مقصد بھیک مانگنا نہ ہو مگر لوگوں نے ان کے آگے سکے پھینکے ہوئے تھے' جن کو آنکھ بھر کر بھی انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ پھر کیوں بجا رہے ہیں۔ یہ سوال میرے دل سے اٹھ رہا تھا۔ ہر گٹار بجانے والا شاید فقیر نہیں تھا۔ ان بے چارے سیاہ فام لوگوں کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا کہ اگر عمدہ لباس نہ پہنے ہوں تو فقیر ہی معلوم ہوتے تھے۔

ڈربن جنوبی افریقہ کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ اس میں مختلف قوموں اور ثقافتوں کے لوگ بستے ہیں۔ یہ شہر بحر ہند کے ساحل پر بسا ہوا ہے۔ ڈربن خوشگوار موسم اور خوبصورت ساحل کے لیے مشہور ہے۔ یہ ایک اہم تفریحی مقام ہے اور یہاں سال میں تقریباً چالیس لاکھ سیاح آتے ہیں۔ گھومتے پھرتے ہیں اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ساحل کے قریب سارا سال تیراکی کی جا سکتی ہے۔ اور وہاں

پر مختلف سمندری کھیلوں اور تفریحات سے لوگ پورا سال محظوظ ہوتے ہیں۔ ساحل کے اردگرد شاندار ہوٹل اور شاپنگ سنٹر موجود ہیں۔ مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگ بستے ہیں۔ اسی لیے یہاں پر یہاں کی چیزیں عمارات' کھانے موسیقی اور لباس پر افریقن آثار نظر آتے ہیں۔

ڈربن میں کئی سالانہ مشہور کھیلوں کے مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ اس شہر میں بین الاقوامی کرکٹ' گالف اور فٹ بال کے مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔

لہٰذا نہ صرف یہ چیزیں ڈربن میں ہیں بلکہ بہت سے پارکس' میوزیم اور آرٹ گیلریز ہیں۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ کسی آرٹ گیلری اور میوزیم میں جاؤں۔ اس وقت میں فارغ تھی اور اپنا وقت گزارنے کے لیے پروگرام بنانا پڑا۔ میں ریسیپشن پر گئی اور اپنا مدعا بیان کیا کہ میں ڈربن آرٹ گیلری جانا چاہتی ہوں۔ ریاض اس وقت کانفرنس میں مصروف تھے اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کوئی میوزیم دیکھ لیا جائے۔ سو ریسیپشن پر کھڑے لڑکے نے اپنی گائیڈ بک نکال کر بتایا تھا کہ ہوٹل سے دائیں جانب ورکشاپ مارکیٹ ہے اور چند قدم کے فاصلے پر ڈربن آرٹ گیلری ہے۔ سو میں ورکشاپ مارکیٹ تو جا ہی چکی تھی لہٰذا آرام سے میں پیدل چلنے لگی اور میوزیم تک پہنچ گئی۔ بہت بڑی بلڈنگ میں داخل ہوئی تو سامنے ریسیپشن پر افریقی عورت بیٹھی ہوئی تھی' سیاہ فام۔۔۔۔۔۔۔ مجھے دیکھ کر دائیں جانب ہال کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ پہلی منزل آرٹ اور سائنس کی گیلری تھی۔ اندر جا کر تو حیرت گم ہوگئی۔ بہت بڑا ہال جہاں پر مختلف آرٹ کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ میں غور سے تصویروں کو دیکھنے لگی۔ کہیں آئل کی پینٹنگ اور کہیں واٹر کلر پینٹنگ تھی۔

Durban Natural Science Museum خوبصورت ترین اور معلوماتی میوزیم تھا۔ اس کی ایجاد ایسی شخصیت سے ہوئی جو اس وقت اس شہر کا چیف انجینئر تھا' C.W.Meihven ۱۹۸۲ء _____ میں اس نے آئل پینٹنگ بنائی اور بطور تحفہ آرٹ گیلری کے لیے پیش کی۔ اس کی اس بات سے دوسرے لوگوں کو بھی خیال آیا اور انہوں نے بھی کوشش کرتے ہوئے پینٹنگز بنائیں۔ سو ۱۸۹۸ء میں Cecilsohn نے واٹر کلر پینٹنگ بطور تحفہ دی۔ اس طرح لوگ بناتے رہے اور برٹش آرٹسٹوں نے بھی طبع آزمائی کی اور میتھون انجینئر نے تصویریں خریدنی شروع کیں۔ یہ تصویریں خریدیں اور کارپوریشن والوں کو پیش کیں اور انگلینڈ سے بھی پینٹنگ خریدی گئیں۔ جب ڈربن میں آرٹ گیلری میں تصویریں رکھی گئیں تو بہت سے شہریوں نے تصویریں بنا بنا کر آرٹ گیلری کے لیے ڈونیٹ کرنی شروع کر دیں اور بے حساب پینٹنگ اکٹھی ہوگئیں۔ صرف ایک شخص نے آرٹ گیلری کا سوچا تو

باقی لوگوں کو بھی جوش آیا اور انہوں نے بھی مدد کرتے ہوئے تصویریں بنائیں۔ ان تصویروں میں افریقہ کے کلچر کا بتایا ہوا تھا۔ ہال کے چاروں طرف تصویریں ہی تصویریں لگی تھیں۔ بہت سے سٹوڈنٹ بمعہ اپنی ٹیچرز کے وہاں معلومات حاصل کر رہے تھے۔ یہ آرٹ گیلری صرف صرف بچوں کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ اس میں ہر عمر کا شخص معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

یہ آرٹ گیلری صبح ساڑھے آٹھ سے لے کر شام چار بجے تک کھلتی تھی۔ اس میں معذور لوگوں کے لیے بھی سہولت کا انتظام تھا۔ جو بھی کوئی معذور نیچے آتا تو اس کے لیے خاص اوپر آنے کے لیے لفٹ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ شوکیس ہال کے درمیان تھے۔ وہاں پر ملبوسات نمائش کے لیے سجائے ہوئے تھے۔ افریقی لباس اور دیگر چیزیں' افریقہ کی بنی ہوئیں' گلاس پر موتیوں کا کور چڑھا تھا یعنی موتیوں سے بنائے گئے گلاس سجاوٹ کے لیے رکھے گئے تھے اور بہت سی ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں تھیں۔ غرض کہ ایک گیلری نہیں تھی بلکہ بڑے بڑے کئی ہال تھے۔ جہاں پر اسی قسم کی پینٹنگز دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ افریقی بچے اور ان کی مائیں بھی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ کین (Cane) کی چیزیں بھی نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔ ایک تصویروں کی دنیا آباد تھی۔ ان تصویروں کو دیکھ کر رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ کہنے کو یہ افریقہ بھی تیسری دنیا میں شامل ہوتا ہے مگر وہاں لوگوں نے اپنے ملک کو سنوارنے اور بنانے میں پوری مدد کی ہے۔ اگر مجھے کوئی کہتا نا کہ یہ تیسری دنیا میں شامل ہے تو میں اس کو دوسری دنیا کا ملک سمجھتی کیونکہ ان کے شاپنگ مال' پارک اور سیر گاہیں اور میوزیم دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو قدرتی نظارے خدا کی طرف سے ان کو انعام میں ملے' دوسرے ملکوں کے مقابلے میں مجھے یہ ملک بھی صاف ستھرا اور ہر آلودگی سے پاک دکھائی دیا ہے اور اتنی ترقی کی ہے کہ بیان کرنا بھی چاہوں تو کر نہیں سکتی۔

ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد میں ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کی طرف دیکھنے لگی۔ درمیان میں جیسا کہ لکھ چکی ہوں' بڑے بڑے شو کیس اور سامنے ہال کی دیوار پر بھی شوکیس تھے۔ ان کی جانب بڑھی تو ہاتھ سے تیار کردہ موتیوں کے کامدار برتن' کٹلری' گلاس اور کوسٹر کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی پلیٹیں' جو خوبصورتی کے ساتھ سجائی ہوئی تھیں۔ اتنا باریک اور نفیس کام ہوا تھا' یہ سب افریقن چیزیں تھیں جو غریب افریقہ کی عورتیں اس کو تیار کرتی تھیں۔

اس گیلری سے نکل کر میں اوپر سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل میں چلی گئی۔ ابھی اس منزل کی راہداری پر تھی کہ بہت بڑا لکڑی کا ڈائنا سار درمیان میں سجایا ہوا تھا۔ اور سامنے دیوار پر ہاتھی کے اوپر کا حصہ ریزرو کر کے لگایا ہوا تھا۔ اس کے بڑے بڑے دانت دیکھ کر خوف آنے لگا تھا۔ اس کو دیکھنے کے بعد میں گیلری میں داخل ہوئی تو کئی جانوروں کی کھوپڑیاں' سانپ اور ہاتھی کے دانت جو اصلی تھے اور جانوروں کی کھوپڑیاں بھی محفوظ کی ہوئی تھیں۔

یہاں پر بھی بہت سی مائیں اپنے بچوں کے ساتھ تھیں بلکہ ایک ٹیچر پوری کلاس کو لے کر آئی ہوئی تھی۔ ایک خاتون میری جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''آپ کہاں سے ہیں؟''

''پاکستان سے۔''

''اچھا' کتنی دور ہے آپ کا ملک؟''

''بہت دور۔۔۔۔۔۔۔تقریباً دس گھنٹے لگ جاتے ہیں۔''

''پسند آیا میوزیم؟''

''بہت''

''آپ کے ملک میں بھی میوزیم ہیں؟''

''جی''

''سنا ہے بہت خوبصورت ہے' خاص کر کے اسلام آباد''

''جی''

''یہاں پر تو کئی آرٹ گیلریز' میوزیمز ہیں۔۔۔۔۔۔۔خوب سیر کی ہے؟''

''بس' کر ہی لی ہے۔'' میں نے اس کے بچے کی جانب دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''یہ اتنا چھوٹا ہے' آپ اسے دکھا رہی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔یاد رہ جائے گا اسے؟''

وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ ''یہ پریپ میں پڑھتا ہے۔ اس کی ٹیچر نے کہا تھا کہ اسے آرٹ گیلری اور نیچرل سائنس آف میوزیم ضرور دکھا کر لاؤ۔''

اتنے چھوٹے بچوں کو ماؤں کی ڈیوٹی لگاتے ہیں دیکھنے کے لیے۔ Hall of Earth Sciences میں کھڑی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ مختلف تھا جہاں جانوروں کو محفوظ کیا ہوا تھا۔ بڑوں کو دیکھ کر ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس خاتون کا بچہ نڈر ہو کر دیکھ رہا تھا۔

اس خاتون کو میں کیا بتاتی کہ اپنے ملک میں جو چار چیزیں لاہور میوزیم میں رکھی تھیں وہ بھی غائب ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ شاید

کوئی اور رکھی گئی ہیں۔ پھر یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ کے جوتے تک بادشاہی مسجد سے چوری ہو گئے ہیں۔ لوگ اپنے ملک کو بنانے سنوارنے میں انتھک محنت کرتے ہیں' مگر ہماری قوم کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اس گیلری سے نکل کر Kwanunu Insect Arcade میں گئی تو وہاں پرندوں کی دنیا آباد تھی۔ سارے ہال میں تتلیاں دیوار کے ساتھ شوکیسوں میں کیڑے مکوڑے اور پرندوں کو بھی شوکیسوں میں جوں کا توں محفوظ رکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد پی اے کلانسی گیلری P.A. Clancey Gallary میں شوکیسوں میں چیلیں' پرندے اور طوطے نظر آ رہے تھے۔ یہاں پر بھی بے شمار شوکیس تھے جہاں پرندے ہی پرندے تھے۔ اس گیلری کے بالکل سامنے ایک اور گیلری تھی 'Wacampbell Gallery' جہاں پر ہرن' ورلڈ انیمل گیلری تھی۔ گھوڑے اور ہر چوپایہ جانور محفوظ تھا۔ لوگ خوشدلی سے اس گیلری میں بھی گھوم پھر رہے تھے' بلکہ بچے بھی Hall of Amphibans and Reptitles ساؤتھ افریقن سانپ اور چھپکلیاں' مینڈک' کچھوے غرض کہ بہت کچھ محفوظ کیا ہوا تھا۔

اس بڑے سے میوزیم میں کافی شاپ بھی تھی جو لوگوں کی سہولت کے لیے بنائی ہوئی تھی۔ آرٹ گیلری سے نکل کر کچھ لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ سانپوں کو دیکھ کر بھی بچے ڈرے نہیں تھے بلکہ خوش دلی سے والدین کے ساتھ کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ جہاں دیکھو لوگ ہی لوگ اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ وہاں کی بھی اپنی ہی دنیا تھی۔ آرٹ گیلری سے نکل کر باہر فٹ پاتھ پر آئی تو ہر قسم کا شخص دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان عورتیں حجاب میں گھوم رہی تھیں۔ شاپنگ سنٹر بند نہیں تھے۔ سیر گاہوں پر زیادہ تر ہجوم تھا۔ زیادہ تر سیاہ فام کھلم کھلا آزادانہ طریقے سے گھوم پھر رہے تھے۔ یہ ان کا ملک تھا۔ یہاں ان کو آزادی تھی۔ فٹ پاتھ سے گزری تو ویل چیئر پر بیٹھا فقیر خاموش راہ چلتے راہ گیروں کو دیکھ رہا تھا مگر کچھ مانگ نہیں رہا تھا جس کا جی چاہتا تھا وہ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتا تھا۔ اسی طرح ایک عورت فرش پر چادر بچھائے بیٹھی تھی' مانگ وہ بھی نہیں رہی تھی بلکہ لوگ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس کی مدد کر رہے تھے۔ یہاں پر بھی غربت تھی' مگر گداگری ہمارے ملک کی طرح نہیں تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ کافی لوگوں کو ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ چلتے چلتے سیاہ فام کو دیوار کے ساتھ لگے دیکھتی تو خوف سا پیدا ہوتا' کہیں لٹیرا تو نہیں۔ مگر کئی لوگ اس روپ میں دکھائی دیتے تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ لٹیرا کون ہے اور اچھا انسان کون۔۔۔۔۔۔۔ سب لوگوں کا روپ ایک جیسا تھا۔ اب بازار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں واپس ہوٹل جا رہی تھی۔ چار بج گئے تھے۔ اور کانفرنس کا اختتام ہو گیا تھا۔ سوچا یہی تھا کہ ہوٹل پہنچ کر ریاض کو لے کر بازار کا چکر لگاؤں کیونکہ کچھ دکانیں ابھی تک کھلی تھیں اور پانچ بجے تک کھلی رہتی تھیں۔

ہوٹل پہنچی تو لابی میں میرے میاں انتظار کر رہے تھے۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ میں پہنچوں اور وہ میرے ساتھ گھومنے کے لیے نکلیں۔

بازار میں ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک طرف ڈھول بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ فٹ پاتھ کے بائیں جانب سیڑھیاں نیچے اتر کر کھلے ایریا میں آ رہی تھیں ہم اس سمت مڑ گئے تو ایک گروپ باقاعدہ ساز ڈھول اور پیانوں کے ساتھ گا بجا رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم برپا تھا۔ دنیا اکٹھی ہو رہی تھی۔ لوگ اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ وہاں جمع ہو رہے تھے۔ گانے والے افریقی سننے والے زیادہ تر افریقی تھے۔ چاروں طرف سیاہی مائل رنگت کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ ان کے ڈھول کے ساتھ ساتھ کوئی لوگ ان کے ساتھ شامل ہو کر گا بجا رہے تھے۔ اپنی چھٹی بڑے اچھے طریقے سے منا رہے تھے۔ ویک اینڈ تھا۔ ہر کوئی فارغ دکھائی دے رہا تھا۔ کئی لوگ باقاعدہ ان کی مووی بنانے میں مشغول تھے۔ یہ بھی کچھ نہیں مانگ رہے تھے۔ بس اپنی محنت سے لوگوں سے داد اور چند رینڈ وصول کر رہے تھے۔ بھیک مانگنے کا انداز مجھے اچھا لگا تھا۔ دوسروں کو خوش کر کے ان کا دل جیت رہے تھے۔ اور محنت سے روپیہ بنا رہے تھے۔ یہ بھی ان کا ایک آرٹ تھا۔

آہستہ آہستہ اور لوگ بھی آنے لگے۔ پھر وہاں اتنا ہجوم ہو گیا تھا کہ کسی کی بھی جیب کٹ سکتی تھی۔

میں نے اپنے میاں سے کہا۔

''یہاں سے چلنا چاہیے۔''

''یہ اپنے کلچر کے گانے گا رہے ہیں۔ سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''لیکن یہاں پر جیب بھی کٹ سکتی ہے۔''

''ہمارے پاس اس وقت کوئی کرنسی نہیں ہے' ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

گانے والے سب مرد تھے۔ کبھی پیانو بجاتے اور کبھی ستار پر گاتے اور کبھی کبھی تو جوش پر آتے ہوئے خوب ڈھول بجا بجا کر لوگوں سے داد اور رینڈ یعنی روپے لیتے۔۔۔۔۔۔۔ کئی ویل چیئر پر بیٹھے بوڑھے محظوظ ہو رہے تھے۔ بے چارے گھر کی چار دیواری سے نکل کر اپنے لیے تفریح کا سامان ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ جب ڈھول بجاتے تو وہ خوب ہنستے' بالکل بچوں کی طرح ۔۔۔۔۔۔۔ سچ ہے بوڑھا بھی ایک بچے کی مانند ہو جاتا ہے۔

ریاض ہجوم سے نکل کر فٹ پاتھ جو ڈاؤن ٹاؤن کے پلازہ کی جانب جاتا تھا' پر لے گئے اور ہم وہاں کی سڑکیں ناپنے لگے۔ افریقہ کا اپنا ہی کلچر اور اپنا مزاج تھا۔ جہاں میں اپنے میاں ریاض احمد کے ساتھ گھوم پھر رہی تھی۔

ویک اینڈ کی وجہ سے ہر جگہ رونق تھی۔ لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ ہفتہ بھر کے لیے گروسری خرید رہے تھے۔ فٹ پاتھوں پر لوگوں کا رش تھا۔ فیشن ایبل نوجوان لڑکیاں ہار سنگھار کیے اپنے چاہنے والوں کے ساتھ ریستورانوں کی جانب یا کسی Pub کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ سیاہ فام کی بجائے گورے لڑکے ان کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اپنی دھن میں مست بغیر کسی کی پرواہ کیے آگے' لوگوں کی بھیڑ چیرتے ہوئے آگے ہی بڑھ رہے تھے۔ گورے اور سیاہ فام کا ملاپ۔۔۔۔۔۔۔ حیرت انگیز لگ رہا تھا۔

ڈربن کانفرنس کے تمام مندوبین کو عشائیہ دیا جا رہا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر سڑک عبور کر کے ایک ایسی بلڈنگ تھی جس میں دائیں جانب کانفرنس کا انتظام تھا۔ اور بائیں جانب بہت بڑے دالان کے آگے ہال تھا وہاں پر کھانے کا انتظام تھا۔ مگر کالے لباسوں میں مندوبین خواتین بناؤ سنگھار کیے اپنے شوہروں کے ہمراہ کھڑی تھیں۔ کافی ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔ ہال کی ریسیپشن کے باہر انگیٹھیوں میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ وہاں دونوں طرف لائن کی صورت میں لڑکے جنگلی لباس میں ملبوس ہاتھوں میں برچھیاں لیے کھڑے تھے۔ اور ہر آنے والے کو دیکھ کر خوشی سے ناچتے۔ یہاں ہر کوئی اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ کارڈز ایکسچینج ہو رہے تھے۔ دھیرے دھیرے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ اندر ہال میں گول میزیں لگی تھیں۔ اگلی میزوں پر چیف جسٹس صاحبان کی اور پیچھے ججوں اور وکلاء کی لگی تھیں۔ سامنے سٹیج پر میوزک کا پروگرام تھا۔

سٹیج کے دائیں اور بائیں طرف بڑی بڑی سکرین سینما ہال کی طرح لگی تھیں۔ جہاں سٹیج کی ساری کارکردگی ان سکرینوں میں دکھائی جانی تھی یہ پیچھے بیٹھنے والوں کی آسانی کے لیے یہ اہتمام تھا۔

ہر طرح کے جوسز مشروب پینے کے لیے سرو ہو رہے تھے۔ اس عشائیہ میں آنے کے لیے امریکی ۴۵ ڈالر پر ہیڈ دیئے گئے تھے۔ وہاں ان ملکوں میں عار نہیں سمجھا جاتا کہ دور دیس سے آنے والوں سے کھانے کے روپے نہ لیے جائیں۔ ہر بات کھری کرتے ہیں' لحاظ نہیں چلتا۔ ہمارے ملک میں ہو نہ ہو' مگر لحاظ کیا جاتا ہے۔ دور سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹس کو کھانے کھلائے جاتے ہیں۔ وہ کھانے خوشی خوشی کھا لیتے ہیں مگر اپنے اپنے ملکوں میں وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کا رواج ہے۔ جب پاکستانی جاتے ہیں تو امریکن سسٹم پر اتر آتے ہیں۔ خیر یہ بھی ان کے کلچر اور تہذیب و تمدن کا ایک حصہ ہے۔ اس کو برا نہیں ماننا چاہیے۔

سٹیج پر مائیک' پیانو اور دیگر ساز پڑے تھے۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے ان سکرینوں میں Kingdom of

Zulu کی فلم دکھائی جارہی تھی۔ اس میں سارا افریقہ کا کلچر دکھایا جارہا تھا۔ اس میں پرانے وقت کے لوگوں کا رہن سہن' کیسے جنگل سے نکل کر مہذب ہوئے تھے' پھر سمندر میں مگر مچھ کے سین اور جنگل میں جانوروں کو پھرتے' اچھلتے کودتے دکھا رہے تھے۔ لوگ بھی جنگلی جانوروں کی طرح تھے۔ جب ان میں سوجھ بوجھ آئی تو کس طرح رہنے لگے۔ پھر Zulu سلطنت اور جانوروں کے بارے میں فلم چلی۔ ذولو سلطنت کے بہترین وسائل میں سے ایک وہاں کے جنگلی جانور ہیں۔ ان جنگلی جانوروں میں ہاتھی' شیر' اور چیتا تھے جن کو خصوصی طور پر دکھا رہے تھے اور بہت سے نادر جانور بھی تھے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے تک وہاں پر ایک جانور بڑی تعداد میں موجود تھے۔ پھر بڑھتی ہوئی آبادی اور اس سے منسلک مسائل اور قدرتی وسائل اور زمین پر اس کی وجہ سے جو دباؤ پڑا' ان وجوہات کی بنا پر یہ جانور اور ان کے قدرتی ماحول پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ان جانوروں کی تعداد میں شدید کمی واقع ہوئی اور کچھ ذمہ دار لوگوں نے اس خطرے کو دیکھتے ہوئے ان جانوروں کو اور ان کے قدرتی ماحول کو تحفظ کے لیے جہاں یہ جانور بستے تھے وہاں کے بڑے بڑے حصوں کو قومی ورثہ کے طور پر اسے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ ذولو سلطنت میں ۸۰ سے زائد ایسی محفوظ جگہیں ہیں۔ ان میں کچھ جگہوں کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے اور کچھ پرائیویٹ سیکٹر کے ہاتھ میں۔ اس فلم میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذولو کلچر اور اس کی سلطنت کے جانور بخوبی دیکھنے کو مل رہے تھے۔ تمام مندوبین وہ فلم دیکھنے میں محو تھے۔

اسی دوران سٹیج پر دو اشخاص باری باری مائیک پر آئے۔ ایک وزیر انصاف تھے اور دوسرے کالاء ڈیپارٹمنٹ سے تعلق تھا' آنے والوں کو خوش آمدید کہا۔ لمبی تقریر کی اور ساؤتھ افریقہ کی ہسٹری بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ہم کیسے یہاں تک پہنچے۔ پھر آخر میں ایک بار مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

کھانا سرو ہونے لگا اور اس دوران افریقی نوجوان لڑکی کریم کلر کی سکرٹ اور کالا بلاؤز پہنے افریقی انداز میں گانا گانے لگی۔ میوزیشن مائیک کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لہک لہک کر گا رہی تھی۔ گہرے سانولے رنگ کی افریقن جیولری پہنے ہوئے بنجارن کا روپ دھارے ہوئے تھی۔ سکرٹ بھی اس کی لہنگے کی طرز کی تھی۔ ہماری میز پر سپریم کورٹ آف امریکہ کے جج اور ان کی اہلیہ بیٹھی تھیں ۔۔۔۔۔۔۔ چیف جسٹس آف پاکستان شیخ ریاض احمد کے ساتھ گفتگو بھی کر رہے تھے اور کھانا بھی تناول کرنے میں مصروف تھے۔ گانا ختم ہو چکا تھا۔ اب دوسری مرتبہ وہ پھر اسٹیج پر آئی۔ گانے کے ساتھ ساتھ ناچ بھی کرنے لگی تھی۔ جوہانسبرگ میں جو کینیڈین لڑکی ملی تھی وہ یہاں اس کانفرنس میں بھی شمولیت کے لیے آ گئی تھی۔ بلیک رنگ کی میکسی آستینوں سے آزاد تھی۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

بڑی خوش دلی سے کہنے لگی۔

''مجھے یہاں آپ کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ اس کانفرنس میں بھی آپ مدعو ہیں۔'' پھر بتانے لگی۔ ''پندرہ دن شادی کو ہوئے ہیں۔ سارا ہنی مون خراب ہو گیا ہے۔ بس کانفرنس کی تیاری میں لگی ہوئی ہوں۔'' اس نے کوئی فائل پکڑی ہوئی تھی اور تقریر کی تیاری کر رہی تھی۔ سامنے اس کا شوہر ریلیکس تھا۔ وہ گویا ہوئی۔ ''آپ کے میاں بہت ذہین ہیں۔ ان کے دلائل سن کر بہت محظوظ ہوئی کہ پاکستان میں اچھے جج صاحبان ہیں' اس بات کا مجھے علم نہیں تھا۔'' امریکہ کے جج کی اہلیہ نے بھی یہی کہا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا' چلو پاکستان کی شہرت تو ہوئی۔ پھر اس لڑکی سے پوچھا۔

''اچھا پندرہ دن ہوئے ہیں شادی کو۔۔۔۔۔۔۔ مگر تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے۔''

''کیا بتاتی' ہم لوگوں کے سب کام ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ شادی' ہنی مون اور کام۔۔۔۔۔۔۔''

ابھی کھانا چل ہی رہا تھا کہ بہت سارے لڑکے ۱۳ یا ۱۴ سال کے آئے۔ کالی پینٹوں کے اوپر سرخ پھولدار کوٹیاں پہنے ہوئے تھیں اور ان کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ وہ کورس کی صورت میں گانا گانے لگے۔ ان کو سکرین پر بھی بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ اسٹیج کے نیچے کالے لباس میں خاتون ان کے سامنے کھڑے ہو کر ڈائریکشن دے رہی تھی۔ وہ لڑکے ساز اور پیانو بھی خود ہی بجا رہے تھے اور گا بھی خود ہی رہے تھے۔ وہ گانے میں مصروف تھے کہ جنگلی لباسوں کے لڑکوں نے ڈانس کرنا شروع کر دیا تھا۔ جنگل میں رہنے اور جانوروں کے ساتھ مل کر ان کے کرتب دکھا رہے تھے۔ اس طرح ان تمام لڑکوں نے بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر ڈانس کرنا شروع کر دیا تھا۔

بچوں کے جانے کے بعد افریقی آدمی نے ناچ اور گانا گایا۔ پھر ایک بار وہی لڑکی آ گئی تھی جس نے شروع میں گانا گایا تھا۔ بہت سے فوٹو گرافر آئے اور تصویریں کھینچنے لگے' گانوں والوں کی' مندوبین کی۔۔۔۔۔۔۔ اخباروں میں دینے کے لیے۔

امریکن خاتون جو جج آف سپریم کورٹ امریکہ کی اہلیہ تھیں وہ مجھ سے بات چیت کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ مجھ سے پوچھنے لگیں۔

''آپ امریکہ کبھی گئی ہیں؟''

''بہت مرتبہ گئی ہوں۔ میری دو بیٹیاں وہاں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں۔''

''واہ۔۔۔۔۔۔۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''آپ کو کونسا شہر اچھا لگا ہے؟''

''مجھے تو ڈربن زیادہ اچھا لگا ہے۔''

''آپ نے جوہانس برگ نہیں دیکھا؟''

''دیکھا ہے' مگر ڈربن میں زندگی ہے۔''

''آپ نے جوہانس برگ ٹھیک سے نہیں دیکھا۔ زندگی کی گہما گہمی گو نہیں ہے مگر خوبصورتی بہت ہے۔''

''شاید خزاں کی وجہ سے سبزہ سوکھ گیا ہے' اس لیے اچھا نہیں لگا۔ مگر سن سٹی تو بہت ہی اچھا لگا ہے۔''

وہ مسکرائی۔

''سن سٹی کے علاوہ کیپ ٹاؤن تو بے انتہا خوبصورت ہے۔ یہاں سے دو گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ کتنا خوبصورت ہے۔''

''اچھا' ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میرے میاں پاکستان میں بہت مصروف ہیں۔ ان کے پاس فالتو وقت نہیں ہے جو کیپ ٹاؤن جا سکیں۔ دو چار روز میں ہماری روانگی ہے۔ جانا ممکن نہیں ہے۔''

اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ میری باتوں سے مطمئن ہو گئی تھی اور کہنے لگی۔ ''اس شہر کو جی بھر کر دیکھ لو۔ یہ بھی اچھا ہے۔ بیچ پر ضرور جانا۔''

''کل گیٹ وے بیچ پر گئی تھی۔''

''صرف ایک جگہ پر۔۔۔۔۔۔۔ یہاں پر کئی حصے ہیں بیچ کے جو خوبصورت بھی ہیں' ان کو بھی دیکھ لو۔ بہت انجوائے کرو گی۔''

وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی دھیمے انداز میں۔ کافی عمر رسیدہ تھی مگر سیاحت کا شوق رکھتی تھی۔

کھانا ختم ہوتے ہی میٹھا اور چائے' کافی سرو کی گئی تھی۔ کھانا مختصر سا تھا۔ ایک سلاد کی پلیٹ اور دوسرے کھانے کی۔ چکن یا فش لے سکتے تھے۔ آئس کریم اور کافی۔ یہ نہیں کہ درجنوں کے حساب میں ڈشز ہوں۔ باقی کا سب انہوں نے گان بجانے میں صرف کیا ہوا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے تک کھانا چلتا رہا تھا۔ آرام آرام سے کھاتے' باتیں کرتے اور میوزک سنتے ہوئے' محظوظ ہوتے' فکروں کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہر چیز سے بے نیاز دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ راہ جاتے ہوئے غم سینے سے لگا لیتے ہیں۔ سوتے' کھاتے' چلتے پھرتے سوچوں میں گم' اپنے آپ کو فنا کرتے ہیں۔ دوسرے کے غموں کو قریب سے دیکھتے ہیں' ان کا حل سوچتے ہیں' ثواب کی خاطر۔۔۔۔۔۔ مگر یہ لوگ صرف اپنے لیے پیدا ہوتے ہیں اور اپنے لیتے جیتے ہیں۔ ہلٹن ہوٹل کی جانب واپس جاتے

ہوئے شہر کی رونق کو دیکھنے لگی تھی۔ اس شہر میں جوہانسبرگ کے مقابلے میں روشنی تھی ورنہ وہاں تو سرِ شام ہی اندھیرا چھا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی بھی بڑی کم ہوتی ہے۔ چلتے پھرتے سیاہ فام روشنی کم ہونے کی صورت میں کم نظر آتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ اسی اللہ نے ان کو بھی پیدا کیا ہے جس نے سارے جہاں کو۔

ریسیپشن پر لڑکیاں حسب معمول اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ ہوٹل کی دکانیں بند ہو چکی تھیں اور شوکیسوں میں پڑی ہوئی چیزیں تیز روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں۔ کئی لوگ نیچے لابی میں بیٹھے کافی اور چائے پی رہے تھے۔ شاید ٹورسٹ تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی دھن میں مست تھا۔

ہوٹل کی لابی سے نکل کر میں اس سے منسلک ٹیرس پر آ گئی تھی۔ یہ اوپن ایریا تھا' جہاں دور سے پہاڑوں کا رنگ کالا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈربن کا موسم بھی گو جوہانس برگ کی طرح بہت ٹھنڈا نہیں بلکہ خوشگوار تھا۔ آسمان پر چاند ستارے بادلوں کی وجہ سے چھپتے اور نکلتے تھے۔ کافی لوگ میرے علاوہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دو مرتبہ ویٹرس لڑکی پوچھنے آئی کہ کیا لاؤں۔

دو مرتبہ جب آئی تو میں نے اسے چائے لانے کے لیے کہا۔

وہ چائے کا نام سن کر ایک لکڑی کا بکس اٹھا لائی جس میں ہر قسم کی چائے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ییلو لیبل ٹی بیگ نکالا' اس کو دکھایا اور کہا۔۔۔۔۔۔۔ اس کی بنا لاؤ۔ ریاض اس وقت لابی میں کسی جج کے ساتھ بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ویٹرس لڑکی چند منٹوں میں چائے لے آئی تھی۔ پاس بیٹھی ہوئی مندوبین جج صاحبان کی اہلیہ مجھے دیکھ کر مسکراہٹیں چھوڑ رہی تھی اور میں نے مسکراہٹوں کا جواب مسکراہٹوں سے دیا اور چائے پینے لگی تھی۔

اس اوپن ایریا میں بھی بہت بڑے ہاتھی کا سٹیچو بنا ہوا تھا۔ جہاں جاؤ تو کسی نہ کسی جانور کا سٹیچو ضرور دیکھنے کو ملتا تھا۔

صبح ناشتہ کے لیے ڈائننگ ہال میں گئی تو بہت سی فیملیز بمعہ اپنے بچوں کے ناشتہ کرنے میں مصروف تھیں۔ بوفے کی صورت میں بہت ساری اشیاء یہاں تک کہ سفید چاول اور سبزیاں تک رکھی ہوئی تھیں۔ سیاح اپنی سہولت کے لیے اگر ناشتہ اچھی طرح کر لیں تو دوپہر کا کھانا کھانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ ہر قسم کا موسمی پھل سامنے تین بڑے بڑے شیشے کے برتنوں میں مختلف فریش جوسز مشین کے ذریعے بن کر گھوم رہے تھے۔ آڑو کا جوس' امرود اور مالٹوں کا۔۔۔۔۔۔۔ سامنے چولہے کے پاس ایک سیاہ فام عورت انڈے اور بیف حسب منشا تل رہی تھی۔ موٹے موٹے نین نقش کی عورت کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ میں نے جوس گلاس میں ڈالا

اور میز پر بیٹھی ہی تھی کہ آواز آئی۔

''السلام علیکم''

میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک عورت میکسی پہنے ہاتھ میں تسبیح لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔

''وعلیکم السلام'' ایک دم اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

''آپ کہاں سے آئی ہیں؟''

''پاکستان سے۔۔۔۔۔۔۔اور آپ؟''

''میں جوہانسبرگ سے آئی ہوں' ہولی ڈے منانے کے لیے۔''

''آپ کب سے ہیں یہاں پر؟''

وہ مسکرائی اور جواب دیتے ہوئے گویا ہوئی۔

''میں نے آنکھ ہی یہاں کھولی ہے۔ میرے والدین بھارت سے آئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے خالی کرسی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

میاں اس وقت کانفرس میں مصروف تھے۔ میں نے خوش دلی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔''ضرور بیٹھئے۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اردو بولنے میں اسے خاصی دشواری ہو رہی تھی لہٰذا اردو بولتے بولتے انگریزی بولنے لگ جاتی تھی۔

''آپ بھارت تو جاتی ہوں گی۔''

وہ اداسی سے بتانے لگیں۔

''بھارت میں دادا دادی' نانا نانی تھے' مگر ان سب کا انتقال ہو چکا ہے۔۔۔۔۔۔۔ پھر کس کے پاس جاؤں؟''

''آپ کے بچے کہاں ہیں؟''

''وہ بھی یہاں پلے بڑھے اور یہیں پر ان کی شادیاں ہو گئی ہیں۔''

''مسلمان گھرانوں میں؟''

''الحمدللہ۔۔۔۔۔۔۔ مسلمان گھرانوں میں بیٹے اور بیٹی کی شادی ہوئی ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی اکیلے رہتے ہیں۔''

''کہاں۔۔۔۔۔۔۔ جوہانسبرگ میں؟''

''جی۔۔۔۔۔۔۔بیٹا نیویارک میں ہے۔خیر سے اچھی ملازمت پر فائز ہے۔بیٹی اسی شہر میں ہے۔''

''آپ ہوٹل میں کیوں ہیں۔۔۔۔۔۔۔بیٹی کے گھر رہ سکتی تھیں۔''

''رہنے کو تو رہ سکتی تھی مگر لانگ ویک اینڈ تھا۔ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں گھومنے کے لیے نکل جائیں۔سو میں نے چاہا ہوٹل میں ہی رہا جائے تاکہ ان کو کہیں جانے میں دشواری نہ ہو۔''

وہ جوس لے آئی تھی۔آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے جوس پی رہی تھی۔

''آپ نے انڈا ابلا ہوا منگوایا ہے۔۔۔۔۔۔۔کیا آملیٹ نہیں کھاتیں؟''انہوں نے ایک دم سے مجھ سے پوچھ لیا۔

''دراصل ایک ہی برتن میں آملیٹ' گوشت اور طرح طرح کی چیزیں تلتی ہیں' دل مان نہیں رہا تھا۔''

''آپ بجا کہتی ہیں مگر ہم تو یہاں پر مستقل طور پر رہتے ہیں' کہاں تک اپنے آپ کو بچائیں۔کوشش تو بہت کرتے ہیں مگر اتنی زیادہ پرہیز کچھ دنوں کے لیے تو چل جاتی ہے مگر مستقل طور پر نہیں چلتی۔''اس نے جوس ختم کیا اور آملیٹ بنوا کر میرے قریب آن بیٹھی۔

''آپ کھائیں گی؟''

''شکریہ' میں انڈا لے چکی ہوں۔''میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا ہے' اپنے آپ کو بچا کر رکھتی ہیں۔میں تو ہر چیز کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیتی ہوں۔''

''پڑھنی بھی چاہیے۔کیا یہاں پر حلال گوشت آسانی سے مل جاتا ہے؟''

''بہت آسانی سے۔۔۔۔۔۔۔بلکہ یہاں پر بہت سے کھانے پینے کے ریستوران حلال کھانوں کے ہیں' کیونکہ مسلمان بہت ہیں۔''

خاتون عمر رسیدہ تھیں' ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتی تھیں۔اردو میں کرتیں تو دقت محسوس کرتی تھیں لیکن انگریزی بھی کوئی اتنی اچھی نہیں تھی۔میکسی پہنے' بغیر دوپٹے کے تھی' سر پر حجاب پہنا ہوا تھا۔یہ پہلا ملک تھا جہاں پر بہت سی خواتین حجاب میں نظر آئی تھیں۔میں شیشے کی کھڑکیوں سے باہر کا منظر بھی دیکھ رہی تھی۔عین سوئمنگ پول کے کنارے پر ریستوران تھا۔دور سے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔مطلع اس وقت ابر آلود ہو گیا تھا۔وہ خاتون ناشتہ کر کے مجھ سے اجازت لے چکی تھی۔میں بادلوں کی گرج چمک سن رہی تھی۔ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے لوگ سوئمنگ میں مشغول تھے۔پول سے تھوڑے فاصلے پر ستانے کے لیے آرام کرسیاں پڑی تھیں۔کئی سیاہ فام

خواتین اپنے کالے جسموں کی نمائش کئے ان کرسیوں پر ستا رہی تھیں۔ اس ملک میں خاصے مسلمان تھے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہورہی تھی۔ چلو دیار غیر میں اپنے مسلمان بھائیوں کی کمی نہیں ہے۔

ناشتہ کے بعد میں باہر نکل کر اس پول سے منسلک اوپن ایریا میں آ گئی۔ جہاں ناشتے اور کھانے کے لیے میزیں لگی تھیں۔ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ حسب معمول کانفرنس کا سیشن چل رہا تھا۔ اس اوپن ایریا میں اس وقت سوائے میرے کوئی موجود نہیں تھا۔ لہٰذا کھلی فضا میں دور سے پہاڑوں کو اور ابر آلود موسم کو انجوائے کرنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی تو ٹھنڈی ہوائیں ایک دم سے چلنے لگیں۔ دور پول پر نہاتے ہوئے لوگ اپنی دھن میں مست نہانے میں مصروف تھے۔ آرام کرسیوں پر لیٹی ہوئی خواتین کو بھی بوندا باندی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ انجوائے کر رہی تھیں' Relax _____ دنیا کے ہر غم کو بھول جانا چاہتی تھیں۔ ذرا تیز بارش کے چھینٹے پڑے تو میں برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ اور وہاں پول کی فضا اور وہاں بیٹھنے والوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

ہوٹل کے کوریڈور سے گزرتے ہوئے میں کانفرنس ہال کی جانب جا رہی تھی۔ اس وقت دوپہر کی بریک ہونے والی تھی۔ دور دراز سے آئی ہوئی خواتین سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور پردیس میں وقت بھی اچھا پاس ہو جاتا تھا۔ کانفرنس ہال میں جانے سے پہلے سکیورٹی دروازے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اپنا پرس دکھا کر اندر جانے کی اجازت ملتی تھی۔

لہٰذا پرس کی چیکنگ کروا کر میں اندر جانے والی تھی کہ سکیورٹی آفیسر ایک خاتون جو کہ سیاہ فام تھی' مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''آپ کا ملک کیسا ہے۔۔۔۔۔۔ کیا ڈربن جیسا خوبصورت ہے؟''

میں ایک سیکنڈ کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ایک دم سے بتایا۔ ''ڈربن کی طرح ہمارے پاکستان کا شہر کراچی ہے مگر وہاں پہاڑ ساحل سمندر کے پار نظر نہیں آتے۔ ہمارا ملک بھی بہت خوبصورت ہے۔''

وہ بات چیت کرنے لگی تھی تو میں اس کے برابر والی خالی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''لوگ کیسے ہیں وہاں؟''

''جیسے ہم لوگ ہیں' تقریباً ایسے ہی ہیں۔ ہر ملک میں اچھے برے انسان ہوتے ہیں۔''

''یہ تو ہے۔۔۔۔۔۔ ایک ہماری ہی کلاس کے لوگ لٹیرے ہیں' ان سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔''

''کیا آپ لوگوں کو بھی لوٹ لیتے ہیں؟''

''اور کیا۔۔۔۔۔۔ ان کی نظر میں کالا گورا کوئی معنی نہیں رکھتا بس پیسہ۔۔۔۔۔۔ پیسے کو فوقیت دیتے ہیں۔''

میں حیران سی اس کی باتیں سن رہی تھی اور وہ خود ہی بتانے لگی۔

''پچھلے سال بھی اسی طرح کانفرنس تھی تو پاکستان کے بارے میں چند لوگ بتا رہے تھے کہ ہم گئے تھے اور چوریاں گھر گھر ہو رہی تھیں۔''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا نا کہ اچھے اور برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بے انتہا غربت ہے۔ جس کی وجہ سے چوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن آپ کے ملک میں ویسی غربت نہیں ہے۔''

''آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہاں پر کتنی غربت ہے۔ لیکن گداگری کو پسند نہیں کیا جاتا۔''

''تو چھین کر گزارا کرتے ہیں؟''

''ہاں ان کا سٹائل شروع سے ایسے ہی چلا آ رہا ہے۔ غریب لوگ ہی نہیں چھینتے اس میں کھاتے پیتے لوگ بھی ہیں۔ بس عادت کی بات ہے۔''

وہ سیاہ فام ہو کر ان لوگوں کی برائیاں کر رہی تھی اور مزید پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی کہ وہاں دروازے کے پاس چند لوگ اور بھی آ گئے تھے۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا اور وہاں سے ہٹ کر جلدی سے اندر ہال میں چلی گئی تھی۔

کانفرنس ہال میں حسب معمول بحث ہو رہی تھی۔ ماحولیات کی آلودگی کے بارے میں طرح طرح کے دلائل دے رہے تھے۔ اس کے بعد اپنے میاں کو دلائل دیتے ہوئے سکرین پر دیکھا۔ پیچھے بیٹھنے والے سکرین پر ان کو دلائل دیتے ہوئے دور سے دیکھ سکتے تھے۔ اور ان کی گفتگو غور سے سن رہے تھے۔ اس کے بعد میں ڈاؤن ٹاؤن میں سڑکیں ناپنے لگی تھی۔

ڈربن ایسا شہر تھا جہاں Where East meets West meets Africa جو ساری دنیا میں مختلف شہر تھا۔ جہاں ہر رنگ اور نسل کے لوگ دکھائی دیتے تھے' جہاں بڑے بڑے سٹور' بڑے بڑے پارکس اور گالف کورس تھے۔ وہاں دنیا حسین تھی' مقامات خوبصورت تھے' میوزیم' پھولوں کی مارکیٹ' سب سے بڑی بات یہ دیکھی جہاں بڑے بڑے مال شاپنگ تھے۔ اس کے مقابلے میں وکٹورین سٹائل کی مارکیٹ بھی ملیں گی۔ بے انتہا آرٹسٹس اور ڈرافٹ کی چیزیں' ذولو (Zulu) کا کلچر' گانا بجانا' بہت ساری Rivels Bar ہلٹن ہوٹل میں دستیاب تھیں۔ ڈانس کلب بہت پاپولر تھے۔

اس طرح Architectural Heritage سٹی ہال جو ۱۹۱۰ء سے اس کا ڈیزائن کیا گیا تھا۔ بعد میں اس کی تعمیر ہوئی۔ اس میں لائبریری' میوزیم' آرٹ گیلری اور میونسپل آفسز ہیں۔ اور بہت سارے مذہبی ادارے جیسے گرے سٹریٹ مسجد' جو سب سے بڑی

مسجد ساؤتھ افریقہ کی تھی' اسی طرح بہت سے مندر اور چرچ تھے۔

ڈربن ایسا شہر تھا جس کی اپج پر قدرتی جنت تھی جو لوگوں کی دلچسپی کے لیے شاید قدرت نے بنائی تھی' صرف آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر یہ جنت آپ کو دیکھنے میں ملتی ہے۔ جہاں سانس لینے سے ٹھنڈک پڑتی ہے اور آبشاروں کا دریا میں گرنا خوبصورت مناظر' خدا اور اس کی خدائی پر یقین آنا' سب باتیں حیران کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جہاں بہت سارے فارسٹر اور نرسریز کے علاوہ ذولو قبیلے کے سفاری پارکس بھی نظر آتے ہیں اور دوسری جانب تحفوں کی دکانیں' ریستوران فارم سٹال جیسے موٹر پر جاتے ہوئے فارم کے باغوں پر تیار کردہ پھل ریڑھیوں پر بکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور گرے سٹریٹ پر بالکل پاکستان کی طرح ریڑھیوں پر برتن' مصالحے' ضروریات زندگی کی ہر اشیاء بازار میں چلتے ہوئے سستے داموں ملتی ہیں۔ اس بازار میں اتنا ہجوم تھا' وہاں پر خریداری ہر طرح کی قوم و نسل کر رہی تھی۔ شاہ عالم مارکیٹ کی طرح مجھے وہ بازار لگا تھا۔ یہ متوسط اور غریب لوگوں کا بازار تھا۔

مجھے ہوٹل پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ مشہود اشرف اور ان کی اہلیہ ہمیں لنچ پر باہر لے جانے والے تھے۔ کوئی پاکستانی ریستوران ان کا جانا جانا پہچانا تھا وہاں پر لے کر جانا چاہتے تھے مگر میں مارکیٹ میں گھوم رہی تھی۔

لیکن یہاں پر صحیح افریقن کلچر دیکھنے کو مل رہا تھا۔ یہاں پر بھی عورتوں کے لباس زیادہ تر بنجارنوں کی طرح تھے' بلکہ ہاتھوں میں پلاسٹک کی چوڑیاں اور بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے آپ ان سے سستے داموں میں اشیاء خرید سکتے ہیں۔ چار عورتوں کی ریڑھی کے پاس ایک مرد ہوتا یا کسی ریڑھی پر مرد نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اتنا وقت میرے پاس نہیں تھا کہ ان سے پوچھتی کہ آپ لوگوں کے شوہر کہاں پر ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر صاف ظاہر تھا کہ کہیں اور ملازمتیں اختیار کیے ہوئے ہیں یا ان کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس بازار میں بہت رش تھا۔ جس ریڑھی کے قریب سے گزرتی وہ خاتون آوازیں دے کر بلاتی' چیزیں دکھاتی' لیکن ریڑھیوں کے علاوہ جو دکانیں تھیں وہاں پر بھی افریقن یا ہندو خواتین نے دکانیں لگائی ہوئی تھیں۔ وہاں پر ہندنی عورتیں بھی کثرت کے ساتھ میں نے دیکھی تھیں۔ اسی طرح پاکستانی بھی بہت تھے۔

دوپہر کے وقت ہلٹن ہوٹل میں مشہود صاحب اور ان کی اہلیہ ہمیں لینے کے لیے آ گئے تھے۔ لابی کے عین سامنے جیولری کی دکان پر کھڑی میں سیل خاتون سے گفتگو کر رہی تھی کہ اس نے دو دن کی چھٹی کی تھی۔ گزشتہ دنوں اس نے بتایا تھا کہ اس کی والدہ معذور ہے اور وہ شادی نہ کر سکی تھی۔ وہ بتانے لگی۔

''ماما بیمار ہوگئی تھیں' اسے ایک رات ہاسپٹل میں رکھا تھا سو میں دو دن نہیں آسکی تھی۔''

''اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟''

''خدا کا شکر ہے کہ بہتر ہے۔''

اس کی بات سن کر خدا حافظ کہا اور آنے والے مہمانوں سے سلام دعا کی۔

مشہود اور شائستہ آج پاکستانی کھانا کھلانے والے تھے۔ دس منٹ کی ڈرائیو پر ریستوران تھا۔ راستے میں پوچھنے لگے۔

''بھابی اس کے علاوہ کہیں اور جانا پسند کریں گی؟'' مشہود بھائی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''بیچ کے کنارے جو سوغاتوں کی دکانیں ہیں وہاں ضرور جاؤں گی۔ افریقہ کے سوینیر لینے ضروری ہیں۔''

ٹھیک کہا ہے آپ نے' ہوٹل کی نسبت وہاں بہت سستی چیزیں ملیں گی۔''

شائستہ نے بھی اپنے میاں کی تائید کی۔ گاڑی ڈاؤن ٹاؤن کی حدود سے گزرنے لگی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ نہ سردی اور نہ ہی گرمی۔ حالانکہ پاکستان کی گرمی کھا کر آئی تھی۔ دن کے وقت آج ہجوم نہیں تھا۔ اتوار کا دن اور سوائے ریستورانوں اور گروسی سٹور کے سب شاپنگ ایریا بند تھے۔ لوگوں کو سودا سلف خریدتے دیکھ رہی تھی یا دور سے بیچ پر بیٹھے لوگوں کو ستاتے ہوئے اور آرام کرتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ مشہود صاحب نے ایک انڈین ریستوران میں گاڑی پارک کی اور ہمیں ساتھ اندر لے آئے۔ ایک بندیا ماتھے پر چمکائے لڑکی آگے بڑھی اور اس نے خندہ پیشانی سے علیک سلیک کی۔ میں نے اس کے ماتھے پر بندیا دیکھی تو شائستہ سے پوچھا۔

''یہ تو انڈین ریستوران ہے۔''

وہ مسکرا کر جواب دینے لگی۔ ''یہ انڈین ضرور ہے مگر یہاں پر سب کھانا حلال ہے۔'' یہ بات شائستہ نے تب کہی جب وہ آرڈر لے کر جا چکی تھی۔

میں نے اس ریستوران کے ہال کو چاروں طرف سے دیکھا تو صاف ستھرا ریستوران تھا۔ کافی لوگ وہاں پر کھانا تناول کر رہے تھے' افریقی' پاکستانی اور انڈین۔ جب وہ لڑکی کھانا لے کر آئی تو میں نے پوچھا۔

''یہاں افریقی بھی شوق سے کھاتے ہیں؟''

''ان لوگوں کو ہمارا کھانا بہت پسند ہے۔ بڑے شوق سے ویک اینڈ پر آتے ہیں اور کھانا ہمارے ریستوران سے ہی کھاتے ہیں۔''

میں نے اس کی جانب دیکھا تو نہ صرف بند یا چمک رہی تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی۔ ہم آپس میں گفتگو بھی کر رہے تھے اور کھا بھی رہے تھے۔ مشہود صاحب کی اہلیہ نے کہا۔ ''جب آپ خریداری کر لیں گے تو میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میرے خیال سے اگلی مرتبہ آئی تو آپ کے گھر ضرور آؤں گی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں تو لے کر جاؤں گی۔''

شائستہ نے اتنی چاہت سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکی تھی۔ اس انڈین ریستوران میں کھانا واقعی بہت اچھا تھا۔ وہاں سے کوچ کر کے مشہود صاحب کے ساتھ ہم بیچ کے کنارے جا رہے تھے۔ سارا شہر بیچ کے اردگرد گھومتا تھا۔ چار سو سبزہ آنکھوں کو تقویت دیتا تھا۔

بیچ پر پہنچ کر دیکھا تو بہت سے تانگے جن کے آگے گھوڑوں کی بجائے خود افریقی لوگوں کو بٹھا کر ساحل سمندر کی سیر کرواتے تھے۔ جوں ہی وہاں پہنچے تو انہوں نے پاکستانی طرز پر آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ ان کے لباس Zulu اپنے کلچر کی نمائندگی کرتے تھے۔ جنگلی لباس۔۔۔۔۔۔۔اور فرق اتنا تھا کہ جنگل کی بجائے یہاں پر سمندر تھا۔ ایک تانگے والا اصرار کرنے لگا کہ میرے تانگے میں بیٹھ کر تصویر کھنچوائیں۔ مشہود بھائی نے کہا' یہ بغیر پیسوں کے آفر نہیں دے رہا ہے۔ تصویر کھنچوانے کے بعد روپے وصول کرے گا۔ اس شخص نے اتنی التجا سے کہا کہ ریاض کو رحم آ گیا تھا۔ ہم سب نے تصویریں کھنچوائیں اور اس کے ہاتھ میں چند رینڈ وہاں کی کرنسی تھما دی تھی۔ آگے بڑھی تو تقریباً ساحل سمندر سے ذرا ہٹ کے دو میل لمبی دکانوں کی قطار تھی۔ یہ تمام افریقہ کی سوغاتیں تھیں۔ وہاں افریقی خواتین خاص اپنے لباسوں میں فرشوں دکانیں سجائے بیٹھی تھیں۔ سیاہ فام غریب عورتیں جنہوں نے اپنے ہاتھ سے یہ سب چیزیں بنائی ہوئی تھیں۔ یہاں پر بھاؤ تاؤ بھی کر سکتے تھے۔ بالکل پاکستان کی طرح کا ماحول لگ رہا تھا' بارگیننگ چل رہی تھی۔ لیکن لباسوں سے وہ بنجارن لگ رہی تھیں۔ موٹے موٹے نین نقش سیاہ فام افریقن جیولری پہنے برائے نام انگریزی بولتے ہوئے اشاروں کنایوں سے بتاتی تھیں کہ فلاں چیز کتنے کی ہے۔

کچھ چیزیں وہاں سے خریدیں اور آگے بڑھتی چلی گئی تھی مگر ان کی دکانوں کی لائن ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔ سب کے دام تقریباً ایک جیسے تھے۔

وہاں کا ماحول' وہاں کی فضا دیکھ کر خیال آ رہا تھا کہ میں کسی جنگل میں ہوں یا ساحل سمندر پر۔۔۔۔۔۔۔مشہود صاحب اور ان کی اہلیہ نے ہم سے کہا کہ آپ تسلی کے ساتھ چیزیں دیکھیں اور ہم پیدل سیر کرنے لگے ہیں۔ ٹھیک ایک گھنٹہ کے بعد آپ کو لے جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے وہ میاں بیوی سڑک کے پار فٹ پاتھ پر سیر کے لیے نکل پڑے اور ان دکانوں سے ہٹ کر میں ساحل سمندر کی

سرگرمیاں نوٹ کرنے لگی تھی۔ اتوار کا روز اور وہ بھی چھٹی تھی۔ تبھی ڈاؤن ٹاؤن میں اتنا رش نہیں تھا' سب لوگ تو بیچ پر جمع ہوئے تھے۔ کالے جسم دھوپ کی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ ننگ دھڑنگ افریقی عورتیں صرف سوئمنگ کے لباسوں میں پورے جسم کی نمائش کر رہی تھیں۔ آرام کرسیوں پر' بنچوں پر اور ریت کے اوپر لیٹ کر۔۔۔۔۔۔۔ اور کچھ مرد عورتیں نہانے میں مصروف تھے۔ تمام خاندانوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ دودھ کی طرح سفید لہریں ساحل سے ٹکراتیں اور تیزی سے واپس چلی جاتی تھیں۔ بیچ صاف ستھری' اس کا پانی ہلکے نیلے رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن لہریں جب اٹھکیلیاں کرتیں تو ان کا رنگ سفید دکھائی دیتا تھا۔ سفید اور نیلے رنگ کا امتزاج بہت بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ سورج ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ فضا خوشگوار تھی۔ میں ساحل سمندر پر کھڑی دور بہت دور پہاڑوں کے نیچے لوگوں کے رہائشی گھر دیکھ رہی تھی۔ کئی گھر درختوں کے سرسبز جھرمٹ میں تھے۔ اس کے علاوہ دوسری طرف اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ اس وقت منظر بڑا دلفریب تھا۔ افریقی بچے والدین کے ساتھ ان تانگوں میں بیٹھے ساحل سمندر کی سیر کر رہے تھے۔ اکثر کراچی کی بیچ پر لوگوں کو اونٹ پر سمندر کے کنارے سیر کرتے دیکھا تھا مگر یہاں پر تانگوں کے ذریعے سیر کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ چند بچے فٹ بال کھیل رہے تھے کئی افریقی جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے سمندر کے کنارے سیر کر رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی نیکریں اور چھوٹے ہی بلاؤز ان کے سیاہ جسم پر نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ وہ ان لباسوں میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔ قدرت کا عجیب ہی سلسلہ ہے۔ اگر ان کو خوبصورتی نہیں دی تو ان کے مقامات خوبصورت کر دیئے تھے۔ اللہ ہر قوم اور انسان کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ اگر خوبصورتی نہیں دیتا تو اس کے بدلے مقامات حسین دے دیتا ہے۔ اور غریب تو اولاد نیک عطا کرتا ہے۔ غرض کہ ہر کسی کو کوئی نہ کوئی اچھی چیز ضرور عطا کرتا ہے۔ میں ساحل سمندر پر واک کر رہی تھی۔ میری سوچ اور خیالات کے تانے بانے نہ جانے کہاں کہاں پر الجھ گئے تھے۔ شام جلد ہی افریقہ میں ہو جاتی ہے۔ پانچ بجے سے ہی سورج غروب ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس وقت بھی شام کے دھندلکوں میں افشاں کے سارے خوبصورت رنگ سمندر پر اتر رہے تھے۔ نوجوان جوڑے ان اترتے ہوئے رنگوں کو دیکھ دیکھ کر انجوائے کر رہے تھے۔ وہاں پر بھی ان کی زندگیاں حسین اور رنگین تھیں۔ ابھی سیر ہی کر رہی تھی کہ مشہود صاحب اور ان کی اہلیہ ہمارے قریب آ گئے تھے۔

''بھابی! کیا خیال ہے۔۔۔۔۔۔۔ چلیں؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''جی ضرور' چلتے ہیں۔''

ریاض اس وقت ایک تانگے والے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان کو بتا رہا تھا کہ میری روزی کا ذریعہ ہی یہی ہے کہ میں لوگوں

کو سیر کرواتا ہوں اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرتا ہوں۔ مجھے خوشی بھی ہوئی کہ ہر جگہ پر محنتی لوگ بھی ہیں جو گداگری کے بجائے محنت مزدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اس تانگے والے کو کچھ رینڈ دیئے اور مشہود صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ اس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں لے جا رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ کی ڈرائیو پر ان کا اپارٹمنٹ تھا۔ گاڑی پورچ میں داخل کی۔ شائستہ فلیٹ کا دروازہ کھولا تو صاف ستھرا بڑی ہی نفاست سے سجایا ہوا فلیٹ' آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ افریقی سوغاتوں سے آراستہ تھا۔ ہر چیز میں نفاست ٹپک رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی بالکونی تھی وہاں پر شائستہ لے گئی تو ہم میاں بیوی وہاں کا منظر دیکھ کر حیران ہو گئے تھے۔ فلیٹ کے عین نیچے لان کی سبز گھاس اتنی عمدہ کٹی ہوئی تھی' یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ سبز ایر یا کا لان ہے۔ پھر دور سے سمندر کا نظارہ اور پہاڑوں کا منظر بڑا ہی دلفریب تھا۔ کہنے کو باہر سے وہ چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ ایک تو اس کو ڈی کور اچھا کیا ہوا تھا اور دوسرا وہاں پر قدرتی مناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ میں اور شائستہ وہاں بالکونی میں اس منظر سے لطف لے رہی تھیں کہ مشہود صاحب اور ریاض بھی وہیں آ گئے تھے۔ مشہود صاحب بتانے لگے۔

''ابھی میرے دوست آئیں گے انہیں ریاض صاحب کو ملوانا ہے۔''

چند منٹوں بعد ان کے دوست آ گئے تھے۔

ساؤتھ افریقہ کے شہر ڈربن میں یہ دیکھ کر کہ مسلمان اکثریت سے ہیں اور جہاں کہیں بھی جاتی تو کسی نہ کسی جگہ مجھے مسلمان ملتے تھے' جن کے آباء واجداد انڈیا میں تھے اور وہ کئی سالوں سے یہاں رہائش پذیر تھے۔ میں مشہود صاحب کے گھر بیٹھی تھی تو وہاں پر ایک بوڑھا جوڑا آ گیا تھا۔ شکل وصورت سے وہ خاتون عربی دکھائی دیتی تھی مگر جب پوچھا تو بتانے لگیں۔

''ہم انڈیا سے ہیں۔''

''تو کیا آپ انڈیا جاتی ہیں؟''

''نہیں' بہت سالوں سے ہم یہاں ہیں۔ میری تو والدہ بھی یہاں پیدا ہوئی۔ والدہ کے والدین انڈیا سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔''

''آپ کو خیال تو آتا ہوگا کہ اپنے وطن جانے کا؟''

وہ مسکرائیں اور جواب دیتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''خیال تو تب آئے جب میں نے دیکھا ہو' عرصہ دراز ہو گیا ہے میرے آباء واجداد کو آئے۔ ہم تو اسی ملک کو اپنا ملک سمجھتے ہیں۔

جس علاقے میں رہتی ہوں وہاں پر تمام مسلمان ہیں۔ ہمارے گھروں کے قریب مسجد ہے۔ سب گھروں کے مکین مسجد میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے بچے بھی بڑے پابند ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔"

"تو کیا سکول نہیں جاتے؟"

"جاتے ہیں، مگر شام کو جب لوٹتے ہیں تو ہمارا ساتھ دیتے ہوئے مسجد میں جاتے ہیں۔ کیا بتاؤں، رمضان شریف میں کتنا لطف آتا ہے۔ باقاعدگی کے ساتھ مسجد میں تراویح ہوتی ہے اور روزہ افطار بھی ہم اکٹھے کرتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کوئی اور نہیں سوائے مسلمان گھرانوں کے۔ ہمیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم غیر ممالک میں ہیں۔ بلکہ کسی اور جگہ گھومنے کے لیے جائیں تو اپنے شہر اور ملک سے بہت اداس ہوتے ہیں۔ یہاں پر آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔"

"تو کیا یہاں پر آپ کا علاقہ محفوظ ہے؟ اکثر سننے میں آتا ہے کہ دن دہاڑے ڈکیتی ہو جاتی ہے۔"

"ہمارا علاقہ خدا کے فضل سے بہت ہی سیف ہے۔ کیونکہ ہمارے اردگرد جو گھر ہیں ان میں سب مومن مسلمان ہیں، شاید ان کی برکت سے ہمارا علاقہ بالکل سیف ہے۔ ہمیں بالکل ڈر نہیں لگتا۔ اتنے سال بیت چکے ہیں۔ شہر کے کچھ اندرون حصے ایسے ہیں جہاں کوئی واردات ہو جاتی ہے۔ اب دیکھیں نا پاکستان میں کیا کچھ ہو رہا ہے، اسلامی ملک ہے اور خرافات کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ تو پھر افریقیوں کا ملک ہے۔ مگر ان میں بھی بعض تو بہت ہی اچھے ہیں۔ افریقی مسلمانوں سے ہماری دوستی بھی ہے۔ اکثر مسجد میں ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہر ملک میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ جرائم ہر ملک میں ہوتے ہیں۔"

اس خاتون کا لب ولہجہ تھوڑا سا فرق تھا۔ اردو بھی ٹوٹی پھوٹی بول رہی تھی۔ زیادہ تر انگریزی میں بات کرتی تھی۔ مگر انگریزی بھی برائے نام ہی تھی۔ افریقہ کو کسی صورت بھی برا کہنے یا سننے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ اس کی پرورش یہاں ہوئی تھی، خالص اسلامی طریقے سے۔۔۔۔۔۔۔ اس لیے وہ مطمئن تھی۔

"انڈیا کبھی نہیں گئی تو کیا پاکستان بھی نہیں آئی ہیں؟"

وہ دھیرے سے جواب دیتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "پاکستان ہمارا اسلامی ملک ہے۔ خواہش رکھتی ہوں مرنے سے پہلے پاکستان جاؤں۔ انڈیا چھوڑے سالہا سال ہو گئے ہیں۔ اب پاکستان ایسی جگہ ہے جہاں جانے کے لیے جی مچلتا ہے۔ اگر قدرت کو منظور ہوا تو انشاءاللہ پاکستان ضرور جاؤں گی۔"

"تو کیا خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ بھی نہیں گئیں؟"

''وہاں گئی ہوں' اللہ کے بلاوے پر۔ اب جب اللہ کو منظور ہوا تو پاکستان بھی جاؤں گی۔ وہاں تو چاروں طرف اسلام پھیلا ہوگا۔ اور آزاد ملک کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اب جس علاقے میں رہتی ہوں وہاں علاقہ ہمارا اپنا ہے' ورنہ ملک تو افریقیوں کا ہے۔'' ساتھ ہی اس کا موقف بدل گیا۔

''پاکستان میں آزادی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جیسا بھی ہے بقول آپ کے ڈکیتی اور چوریاں ہوتی ہیں مگر سکون بھی بہت ہے۔ آزادی سے جیتے ہیں اور آزادی سے رہتے ہیں۔'' میں نے وہی جملہ پھر دہرایا۔ وہ میری بات سے متاثر ہوئی اور خواہش پیدا ہونے لگی کہ کسی طرح پاکستان جائے اور اپنے مسلمان بہن بھائیوں کو دیکھے۔

ایک لحاظ سے اس کی خواہش جائز تھی۔ جیسا بھی ہے ہمارا ملک ہے۔ ابھی بھی اس میں چند باتیں اچھی ہی اور لوگ نیک ہیں' ان کی اچھائیوں سے ہمارا ملک قائم دائم ہے۔ لاکھ اچھا کہیں باہر کی دنیا میں بسنے والے مسلمان بہن بھائی۔۔۔۔۔۔۔لیکن اندر سے باہر کے ملکوں کو دل سے پسند نہیں کرتے۔ اوپر سے بھرم رکھا ہوتا ہے کہ ہم خوش ہیں۔ مگر دل کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

رات کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ تقریباً آٹھ بج گئے تھے۔ ان کے دوست ابھی تک بیٹھے تھے۔ میں نے شائستہ سے کہا۔

''مشہود بھائی کو کہو ہمیں چھوڑ آئیں۔ آپ اپنے مہمانوں کے پاس بیٹھیں۔''

مشہود صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور نہیں بیٹھیں گے؟''

''اس وقت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ دوپہر سے پھر رہے ہیں۔ اجازت دیں تو اچھا ہے۔''

شائستہ نے خوش دلی سے بڑی عمدہ چائے پلائی تھی اور وہ مہمانوں کے پاس بیٹھ گئی تھی اور مشہود صاحب ہمیں ہلٹن ہوٹل تک چھوڑ گئے تھے۔

ہوٹل میں اس لیے بھی آنے کی جلدی تھی کہ ٹھیک ساڑھے سات بجے عشائیہ پر جانا تھا اور اس وقت سات بج گئے تھے۔ جلدی جلدی اوپر تیار ہونے کے لیے چلی گئی تھی۔ کانفرنس کے جتنے بھی مندوبین تھے لابی میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید وہ پہلے سے چلے گئے تھے۔ ریاض میرا انتظار نیچے لابی میں بیٹھ کر کرنے لگے تھے۔ پاکستان جانے کے لیے تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ خواتین جو جج صاحبان کے ساتھ آئی ہوئی تھیں وہ کانفرنس کبھی کبھار اٹینڈ کرتیں۔ زیادہ تر وہ شہر میں گھومتی پھرتی اور شاپنگ کرتی تھیں۔

مندوبین کے لیے ایک عشائیہ کا انتظام تھا۔ میں کمرے سے نیچے آئی تو مندوبین کی انچارج خاتون نے ہم سے کہا۔ تمام لوگ بس میں بیٹھ چکے ہیں صرف آپ لوگوں کا انتظار ہے۔ باہر بس کھڑی تھی اس نے ہمیں بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گئی تھی۔ چالیس سال کے لگ بھگ سلم سمارٹ خاتون کالے لباس میں پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

یہ عشائیہ رائل ہوٹل میں دیا جا رہا تھا۔ ڈربن کا خوب صورت اور پررونق ہوٹل تھا۔ جہاں بڑے بڑے فنکشن اور شادی بیاہ کے فنکشن ہوتے تھے۔ جب بس سے اتر کر لابی میں پہنچی تو وہاں ایک پاکستانی دلہن کو باقی لوگوں کے ساتھ ہال کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ بڑی بڑی راہداریوں سے گزر کر چند سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لابی میں پہنچی تو وہاں پر کچھ افریقن شہری پہلے سے ہی موجود تھے۔ مشروب سے تواضع ہو رہی تھی۔ تقریباً کالے لباس زیادہ تر دکھائی دے رہے تھے۔ ان لباسوں کے ساتھ پرلز کی جیولری پہنی ہوئی تھی۔ مندوبین کو وہ منتظم خاتون اپنی اپنی میزوں پر بٹھانے لگی تھی۔ بہت بڑا ہال تھا جہاں میزیں لگی تھیں۔ سامنے دیوار پر بہت بڑی سکرین پر کوئی فلم دکھائی جانے والی تھی۔ ایک کونے پر مائیک اور میز پر کمپیوٹر رکھا تھا۔ ہال میں جانے سے پہلے لابی میں دیوار کے ساتھ ایک میز پر ایک خاتون کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور اسی خاتون نے آج عشائیہ سے پہلے مائیک پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں جانوروں کے بارے میں بتانا تھا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ گئے تو خاتون نے مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ جانوروں سے پیار کریں گے تو وہ بھی آپ سے پیار کریں گے۔ اگر ان سے نفرت کریں گے تو نہ صرف سورج بلکہ زمین بھی ناراض ہو جاتی ہے۔ اللہ کی مخلوق ہے۔ پیار اللہ کو بھی پسند ہے۔ پھر اس نے سکرین کے ذریعے فلم چلائی اور وہ شیر کے بچوں کو چوم رہی ہے۔ انہیں سینے سے لگاتے ہوئے اور شیر کے ساتھ کھیلتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ وہ اپنا تجربہ بیان کر چکی تھی اور اب فلم کے ذریعے لوگوں کو دکھا بھی رہی تھی۔ اگر وہ فلم نہ دکھاتی تو شاید کسی نے یقین نہیں کرنا تھا کہ وہ شیر کے خاندان سے گھل مل کر وقت گزارتی تھی۔ مگر فلم میں صاف طور پر شیر کے بچوں سے پیار کرتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ یہ بھی اللہ کی شان تھی۔ شیر جنگل کا بادشاہ تھا اس کی گرج سے ہی لوگوں پر خوف طاری ہو جاتا تھا مگر یہ خاتون بہادری کے ساتھ اپنا وقت ان کے ساتھ گزار کر جانوروں کی نفسیات پر ایک کتاب لکھ چکی تھی۔ لوگ اس کی فلم دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ کافی دیر تک اس کے مختلف تجربے سکرین پر دیکھتے رہے تھے۔ فلم بند ہو چکی تھی اور کھانا سرو ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میری میز کے سامنے ایک کویتی خاتون اور بائیں جانب امریکن خاتون جو لائر تھی، تقریباً ساٹھ سال سے اوپر تھیں۔ سلاد کھاتے ہوئے باتوں میں محو تھیں۔ کویتی خاتون میری جانب دیکھتی اور مسکرا پڑتی۔ اس کی مسکراہٹوں کا جواب میں بھی مسکرا کر دے رہی تھی۔ کالی ویلوٹ کی میکسی میں ملبوس تھی۔ شراب وہ پی نہیں رہی تھی۔ میرے دائیں

جانب کرسی خالی دیکھ کر وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور انگریزی میں مجھ سے بات چیت کرنے لگی تھی۔

''آپ کا تعلق سعودی عرب سے ہے؟''

''ہوں تو میں عربی مگر کویت میں رہتی ہوں۔ کانفرنس اٹینڈ کرنے کے لیے میں اور میرا میاں یہاں آئے ہیں۔''

''آپ لائیر ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''لائیر تو نہیں ہوں، ہم دونوں کالج میں پڑھاتے ہیں۔ میاں جوہانسبرگ میں کانفرنس پر گیا ہے اور میں ڈر بن آئی ہوں۔''

''مسلمان ہیں؟''

''الحمدللہ'' وہ کہنے لگی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی ہوں۔''

میں نے اس کے لباس کی جانب دیکھا تو پوچھا۔ ''کویت میں ایسا لباس پہنتی ہیں؟''

''توبہ کریں، وہاں تو بایا پہنتی ہوں۔ چہرہ بھی ڈھانپتی ہوں۔ صرف آنکھیں میری باہر ہوتی ہیں۔''

اس وقت وہ بغیر دوپٹے کے تھے اور خاصی سمارٹ لگ رہی تھی۔ اکثر لندن میں عربی خواتین کو ماڈرن لباسوں میں دیکھا تھا۔ اور کہیں کہیں تو وہ خواتین اپنے آپ کو اتنا بنا سنوار لیتی تھیں کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا کہ یہ کون سے ملک کی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔

''تو آپ عربی ہیں؟''

''جی''

''کتنے بہن بھائی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ والد نے کتنی شادیاں کی ہیں؟'' میں نے بے تکلفی سے پوچھ لیا۔

وہ مسکرا پڑی اور جواب دیتے ہوئے بتانے لگی۔

''خدا کا شکر ہے، والد نے صرف ایک شادی کی ہے اور میرا شوہر بھی بہت اچھا ہے۔ اس نے بھی کوئی اور شادی نہیں کی ہے۔ چار بچوں کی ماں ہوں۔ باپ فوت ہو چکے ہیں۔ والدہ ہیں، آٹھ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔''

''والدہ کہاں پر ہیں؟''

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''کیا ہوا والدہ کو؟''

''وہ بے چاری معذور ہیں۔ میرے بڑے بھائی کے پاس کویت میں رہتی ہیں۔''

اس نے پھر کہا۔ ''آٹھ میرے بھائی اور ہم دو بہنیں ہیں۔ دوسری بہن بہت دور رہتی ہے۔ ہفتہ میں ایک بار ماں کے گھر جاتی ہوں۔''

''بھابی خیال کرتی ہوگی؟''

''بھابی۔۔۔۔۔۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بتانے لگی۔ ''آٹھ بھائی ہیں مگر ایک ماں کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بھابی کا منہ ہر وقت بنا ہوتا ہے۔''

''والدہ کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟''

''ایک انڈین لڑکی دیکھ بھال کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ بس وہ ان کا خیال رکھتی ہے۔''

''آپ کویت میں ہیں' لڑکے تو لاپرواہ ہوتے ہیں' آپ بیٹی ہیں جو درد آپ کو ہوگا وہ بھابی کو نہیں ہوسکتا' دل میں مت لائیں' بھائی اچھا ہی ہے تو والدہ کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔''

''بھائی واقعی اچھا ہے مگر بیوی اچھی نہیں ہے۔''

''دیکھیں' آپ ہفتہ میں دو مرتبہ جایا کریں بہت ثواب ملے گا۔ قرآن میں بار بار والدین کی اطاعت کا ذکر آیا ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ بچپن میں ماں اور باپ نے جس طرح پالا پوسا ہے' بڑھاپے میں تم اس طرح ان کی نگہداشت کرو۔ آج تم اپنی ماں کی خدمت کروگی کل کو تمہارے بچے تمہاری خدمت کریں گے۔ مقافات عمل دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ شکر کرو' والدہ کو بھائی نے سنبھالا ہوا ہے ورنہ یورپ امریکہ کے ممالک میں بوڑھے والدین کو اولڈ ہاؤسز میں ڈال دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ ہفتہ میں ایک مرتبہ تم ان کو باہر گھمانے کے لیے لے جایا کرو تاکہ انہیں احساس ہو کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔''

''میں لے کر جاتی ہوں' بلکہ میرا شوہر اتنا اچھا ہے کہ اس کی والدہ وفات پا چکی ہیں مگر وہ مجھے اصرار کرتا ہے کہ تم اپنی ماں کی خدمت کرو۔ خوش نصیبی ہے میری جو میرا عربی شوہر اچھا ہے ورنہ وہ دوسری کیا تین شادیاں اور کر کے بیٹھ جاتا۔''

بار بار وہ عربی خاتون شوہر کی تعریف کر رہی تھی۔ کرتی بھی کیوں نا' عرب میں چار تو ایک طرف نہ جانے کتنی شادیاں رچا لیتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی صحیح طرح پہچان نہیں پاتے۔

یہ خاتون ۴۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ ظاہر ہے میاں پچاس سال کا ہوگا۔ مگر جب ذہن میں دوسری شادی سما جائے تو عمر کی کوئی

قید نہیں ہوتی' بڑھاپے میں شادی رچا لیتے ہیں۔ شاید اب ان میں بھی پڑھ لکھ کر شعور آ گیا تھا۔ بیوی کہیں آئی ہوئی تھی اور شوہر لیکچر دینے دوسرے شہر میں گیا تھا یا اس کے شوہر نے اس لیے بھی شادی نہیں کی تھی کہ وہ اپنی والدہ کا خیال رکھتے ہوئے گاہے بگاہے جاتی تھی' ماں کی دعائیں لیتی تھی تو اس کا شوہر صراط مستقیم پر قائم تھا۔ اسلام میں چار شادیوں کے جائز ہونے پر بھی دوسری شادی کا نام نہیں لیتا تھا' اس کی ماں کی دعائیں تھیں۔ یہ بات میں نے اس کو بتادی تھی۔

خاتون میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میکسی کے ساتھ ساتھ اس نے افریقن جیولری پہنی ہوئی تھی۔ بہت خوش تھی کہ نہ والد نے دوسری شادی کی اور نہ ہی شوہر نے۔ اس نے مجھ سے عہد کر لیا تھا کہ ہفتے میں دو مرتبہ ماں کے گھر جایا کرے گی اور اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرے گی۔

کھانا ابھی تک چل رہا تھا۔ ایک زبردست تبدیلی میں نے یہ دیکھی تھی کہ نیگرو کے ساتھ گوری لڑکی پارٹنر اور گورے کے ساتھ نیگرس لڑکی پارٹنر ہوتی تھی' یعنی دو قومیں ایک ہو گئی تھیں۔ بے شک وہ ملک افریقیوں کا تھا مگر وہاں پر ابھی بھی گورے راج کرتے ہیں۔

رائٹر خاتون چپ چاپ کھانا تناول کر رہی تھی اور مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر گوری لڑکی کالی لیس کا بلاؤز پہنے انگریزی میں گانا گا رہی تھی۔ پیانو پر سیاہ فام لڑکا اور مختلف ساز بجانے والے بھی سیاہ فام تھے۔ یعنی ان لوگوں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا۔ نوجوان خوبصورت لڑکی کالے بلاؤز میں اس کا گورا رنگ اور بھی نکھر گیا تھا۔ اپنی دھن میں گا رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے کویتی خاتون سے پوچھا۔

''کیا آپ لوگوں کے بھی گیت ہیں؟''

''جی۔۔۔۔۔۔۔ بہت اچھا ہماری سنگر گاتی ہیں؟''

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اور ڈانس۔۔۔۔۔۔۔؟''

''وہ بھی کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ مگر سعودی عرب کے دو شہروں میں نہیں' مکہ اور مدینہ''

''اچھا' وہاں پر پابندی ہے؟''

''جی' ہماری سنگر ام کلثوم کا نام تو سنا ہوگا۔ اتنا اچھا گاتی تھی کہ ایک سماں باندھ دیتی تھی۔ اور دوسری سنگر فروز اور بہت سی اور ہیں' کن کن کے نام گنواؤں۔۔۔۔۔۔۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ گوری یورپین لڑکی گانا ختم کر کے کھانے کی میز پر بیٹھ گئی اور ایک نیگرس لڑکی نے آ کر افریقی زبان میں گانا شروع کر دیا۔ اس کے گانے کے ساتھ ساز بھی اونچے ہو گئے تھے۔ اب کی مرتبہ ایک گورا لڑکا پیانو بجانے لگا تھا۔ غرض کہ افریقی لڑکی کے گانے کی سمجھ تو نہیں آ رہی تھی مگر وہ گانا دل کو اچھا لگ رہا تھا۔ مندوبین بڑے شوق سے گانا سنتے اور تالیاں بجاتے تھے۔ ہر کوئی مسرور تھا۔ خوش' شادمان دکھائی دیتا تھا۔ گھر سے نکل کر انجوائے کر رہے تھے۔ صبح کانفرنس میں مغز ماری کرتے رہے تھے اور رات کو Relax ہو کر گانے اور کھانا تناول کر رہے تھے۔ ان کی اپنی دنیا تھی اور دنیا میں رہنے کے ڈھنگ بھی اپنے تھے۔ میں نے فش آرڈر کی تھی۔ سب لوگوں کے لیے چکن لے کر آیا اور میرے سامنے اس نے فش اور چپس کی پلیٹ رکھ دی تھی۔ ایک ویٹر لڑکے کے ساتھ دس ویٹرس لڑکیاں تھیں۔ ان میں انڈین لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے مندوبین کھانے میں مصروف تھے۔ یہاں پر بھی صرف مندوبین ہی نہیں بلکہ اس شہر کے مقامی لوگ بھی شامل تھے۔

کویتی خاتون بھی تالیاں بجا بجا کر داد دے رہی تھی۔ کہاں کویت جیسے شہر میں اپنے آپ کو برقعے میں قید کرتی تھی اور یہاں آ کر اس نے بھی کھلے ماحول میں جی بھر کر گانے والوں کو داد دی تھی۔ ایک بات سے میں بہت متاثر ہوئی تھی۔ مسلمان تھی' پینے پلانے میں مصروف نہیں تھی ورنہ وہ اپنے ملک سے دور تھی' ماڈرن لباس کے ساتھ ساتھ وہسکی یا وائن بھی پی سکتی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میرے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ مسلمان ہوں اور ہمارے مذہب میں پینا حرام ہے۔ ڈائننگ ہال کے چاروں کونوں میں نیچرل پھولوں کی سجاوٹ تھی۔ بس نے گیارہ بجے آنا تھا اور ہمیں ہوٹل میں پہنچانا تھا۔ یہ عشائیہ ڈربن کے رائل ہوٹل میں دیا جا رہا تھا۔ ڈربن کا مہنگا اور اچھا ہوٹل تھا جہاں پر بہت سی دکانیں بھی تھیں۔ اٹلی' امریکہ' سپین اور یورپ کی چیزیں مہنگے داموں میں تھیں۔ اس وقت دکانیں بند تھیں۔ شوکیسوں میں بجلیاں روشن تھیں اور چیزیں بڑی نفاست سے رکھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بہت بڑی جیولری کی دکان بھی تھی۔ ہیرے اور جواہرات کی نادر چیزیں شوکیس میں لگے قمقموں کی وجہ سے جگمگا رہی تھیں۔ یہ چیزیں خریدنا ہماری بساط سے باہر تھا۔

کھانے کے اختتام میں سب ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ اگلے دن کچھ لوگ اپنے وطن جا رہے تھے۔ کانفرنس کا ایک روز باقی تھا۔ کچھ رہنے کے لیے واپس ہلٹن جا رہے تھے۔

ایک بس ٹھیک گیارہ بجے ہوٹل کے باہر کھڑی ہو گئی تھی۔ امریکہ کے سپریم کورٹ کے جج صاحب انتظار گاہ میں بیٹھے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے ہمراہ تھی لہٰذا ہم بھی بس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوں ہی سنا کہ ایک بس پہنچ گئی ہے تو ان لوگوں کے ساتھ ہم

بھی بس میں بیٹھ گئے تھے۔ بس ڈربن ڈاؤن ٹاؤن سے گزرنے لگی تھی۔ تیز روشنیوں کی وجہ سے اونچی اونچی عمارتیں اس شہر کی زینت بنی ہوئے تھیں۔ دس منٹ کی ڈرائیو تھی جوہانسبرگ کی نسبت یہ شہر بہت روشن تھا۔ یہاں پر رات کے وقت بھی رونق تھی شاید ساحل سمندر کی وجہ سے۔

افریقہ میں شام کا وقت بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ فوراً ہی اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ مشہود صاحب ہمیں ہوٹل اتار کر واپس جا چکے تھے۔ میں نے پاکستان جانے کے لیے پیکنگ کر لی تھی۔ رات کا وقت تھا اور کھانے کے لیے ہوٹل سے باہر نکلے تو ورکشاپ پلازہ کی جانب چل پڑے۔ رات کے نو بجے تھے۔ مگر سڑکیں سنسان تھیں۔ میں اور ریاض پیدل چلتے ہوئے ورکشاپ جانا چاہتے تھے مگر ریستوران' پلازہ اور دکانوں کے باہر کئی سیاہ فام لڑکے دیواروں کے ساتھ لگے تھے۔ اس وقت چاروں طرف سناٹا تھا۔ دکانیں' پلازہ تو بند تھے مگر ریستوران میں بھی کوئی اتنی گہما گہمی نہیں تھی۔ عجیب سا خوف دامن گیر تھا۔ ''واپس ہوٹل کی طرف چلتے ہیں۔'' ریاض نے آہستگی سے کہا اور واپس مڑ گئے تھے۔ میں سمجھ گئے تھی کہ یہ سیاہ فام دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے کسی خاص مقصد سے کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم ہلٹن ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ سڑکوں پر اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں جوں ہی ہلٹن ہوٹل کا ایریا شروع ہوا تو وہاں پر خاصی رونق دکھائی دینے لگی تھی۔

''آپ واپس آ گئے ہیں تو کھانا۔۔۔۔۔۔۔؟'' میں نے ریاض سے پوچھا۔

''اب تو ہوٹل سے ہی کچھ نہ کچھ کھانا پڑے گا۔'' انہوں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

لابی میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ رات کی ڈیوٹی دینے والی لڑکیاں ریسیپشن پر آ گئیں اور صبح والی جا چکی تھیں۔ ہوٹل بھی اس وقت خاموش تھا۔ کوئی گہما گہمی نہیں تھی۔

ڈائننگ ہال کی طرف ریاض نے اشارہ کیا اور اپنے ہمراہ ہال میں لے گئے تھے۔ وہاں ہال کے دروازے پر ایک سیاہ فام لڑکی کھڑی تھی جو میز پر جانے کے لیے اجازت دیتی تھی۔ کمرے کا نمبر بتایا اور اجازت ملتے ہی ہال کے اندر داخل ہوئے تو یہاں پر بھی بہت ہی کم لوگ کھانے کی میزوں پر نظر آ رہے تھے۔ یہاں پر بوفے میں کئی ڈشز تھیں۔ ہر طرح کا سلاد پھل اور بن' چیز' جیم اور پاکستانی اچار تک رکھا تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے چولہے لگے تھے۔۔۔۔۔۔۔ اور کاؤنٹر کے اوپر کچی مچھلی (بغیر تیار) گوشت' مرغی' بیف تھا۔ اگر بوفے کھانا پسند نہ ہو تو تو اپنی مرضی کا کھانا (ڈش) بنوا سکتے تھے۔ یہاں پر بھاری بھرکم خاتون جو سیاہ فام تھی' ہال میں ڈنر کی

وجہ سے ہلکی (مدھم) سی روشنیاں تھیں اور اس مدھم روشنی میں اس کا رنگ اور بھی گہرا سیاہی مائل لگ رہا تھا۔ کچھ سیاہ فام ویٹرس لڑکے اور لڑکیاں ڈائننگ ہال میں پھر رہے تھے۔ میں نے ریاض سے کہا۔ ''گرلڈ مچھلی بنوا لیتے ہیں' مناسب رہے گی۔'' ریاض نے واپس میز پر پہنچ کر ویٹرس لڑکی جو سفید بلاؤز اور کالی سکرٹ میں درمیانے جسم کی' تیس یا پینتیس سال کے لگ بھگ تھی' کو بلایا جو آرڈر لے کر چلی گئی۔ جہاں سلاد پڑے ہوئے تھے وہاں سے میں نے اچار کی کٹوری کو پکڑا اور کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے اجازت مانگی۔ اس لیے کہ بوفے ہم لے نہیں رہے تھے اور مچھلی گرلڈ کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ بیس منٹ کا وقفہ بتا کر وہ لڑکی آرڈر لے کر جا چکی تھی۔ مجھے یکدم سے خیال آیا کہ اس سے پیٹا بریڈ کا پوچھوں۔ پیٹا بریڈ بالکل پاکستانی چھوٹے نان کی طرح ہوتی ہے۔ لڑکی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ پیٹا بریڈ موجود ہیں' کھانے کے ساتھ لے آؤں گی۔

کھانا میں نے ان سے بہت گرم مانگا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ٹھنڈے نان اور نیم گرم مچھلی لے آنی تھی کیونکہ بہت گرم کھانے کا انہیں کوئی شوق نہیں تھا۔ جو کچھ بھی ملتا ہے صبر شکر کر کے مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ ہم پاکستانی بہت گرم کھانا اور گرم روٹی پسند کرتے ہیں۔ بیس منٹ کے بعد وہ مچھلی لے آئی تھی۔ تازہ مچھلی کاؤنٹر سے ہم نے چنی تھی۔ اس کا صاف ستھرا کر کے مصالحہ لگا کر وہ اوون میں تیار کر کے لائی تھی۔ وہ کھانا اتنا عمدہ لگا کہ افسوس ہونے لگا' کھانے کا بندوبست یہاں اتنا اچھا تھا پھر یوں ہی ہم مارے مارے پاکستانی ریستورانوں میں پھرتے رہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جہاں کا دانہ پانی لکھا تھا وہاں پر ہی انسان کھاتا ہے۔ بغیر اللہ کی اجازت کے انسان کچھ بھی کھا پی نہیں سکتا۔ اللہ نے ہر شے پر مہر لگائی ہوتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی افسوس جاتا رہا تھا۔

ڈائننگ ہال سے نکل کر کمرے میں جانے کو جی نہیں کرتا تھا۔ لابی میں دائیں جانب سیڑھیاں تھیں۔ میں ریاض کے ساتھ اوپر کی منزل پر چلی گئی تھی۔ ایک تو چہل قدمی کے لیے اور دوسرا اونڈ و شاپنگ کرنے کے لیے گو کہ اوپر کی منزل پر تمام دکانیں بند تھیں' صرف کیمرہ شاپ' ویڈیو کی دکان' جہاں کیسٹیں DVD کی ملتی تھیں۔ اور چھوٹا سا ریستوران جہاں چائے اور سنیک مل جاتے تھے۔ یہ منزل پوری کی پوری دکانوں کی تھی۔ یہاں پر روشنیاں قمقموں کی تیز تھیں۔ وہ منزل تمام شاپنگ ایریا تھا۔ جوتوں کی دکانیں' شیشے کے شوکیس پر رکھے ہوئے جوتے' اٹلی' جاپان اور برازیل کے پڑے ہوئے تھے۔ تیز روشنی کی وجہ سے وہ چمکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈائمنڈ کی دکان اوپر بھی تھی اسی طرح ماڈرن ملبوسات کی دکانیں یورپین انداز کے لباس اور جدید فیشن کے۔۔۔۔۔۔۔ وہ لباس دیکھ کر خیال آیا کہ یہاں کے بسنے والے تو اتنا سادہ لباس میں ہوتے ہیں ان بے چاریوں کو ہوش ہی نہیں ہوتی کہ اتنے عمدہ لباس خرید کر پہن سکیں۔ یہ سب شاپنگ ٹورسٹ کے لیے تھی۔ جو مختلف ممالک سے آ کر یہاں قیام کرتے تھے۔ ورنہ ان بے

چاریوں کے نصیبوں میں یہ چیزیں کہاں تھیں۔ روشنیوں اور قمقموں کی وجہ سے وہ ایریا بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ یہاں پر بے شمار سوینیر کی دکانیں آمنے سامنے تھیں۔ شوکیس میں ان کی قیمتیں پڑھنے میں بہت آسانی تھی۔ تیز بلب کی روشنی میں ان کی قیمتوں کو پڑھ سکتے تھے۔ کیمرہ شاپ شاید ساری رات کھلی رہتی تھی۔

ڈربن میں آخری رات تھی۔ صبح کے وقت گیارہ بجے ڈرائیور کو بلوایا تھا اور ڈھائی بجے کے قریب ائیر پورٹ جانا تھا۔ ڈرائیور گیارہ سے لے کر ڈھائی بجے تک کسی مقام کی سیر کروانا چاہتا تھا یا شاپنگ پلازہ لے جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ یہ ہماری مرضی پر منحصر تھا۔

صبح گیارہ بجے سے پہلے ہی میں نیچے لابی میں آئی تو سوچا۔۔۔۔۔۔۔ کیوں نہ ڈربن کو آخری بار دیکھ لیا جائے۔ وہاں اس شہر کی اپنی ہی خوبصورتی تھی۔ ٹھیک گیارہ بجے ڈرائیور آ گیا تو ورکشاپ شاپنگ پلازہ جانے کے لیے اسے کہا۔ وہ پلازہ زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل بھی جا سکتے تھے۔ مگر وقت کم تھا اور میں نے تھوڑی سی خریداری بھی کرنی تھی۔ ورکشاپ کے اندر سوینیر کی دکانوں پر میں نے شتر مرغ کے انڈے جن پر مختلف قسم کی سینریاں بنی ہوئی تھیں' یا پینٹ کا کام ہوا تھا (Ostridge) شتر مرغ کا انڈا' کافی بڑا تھا۔ خریدنے کو بہت جی کرتا تھا مگر ریاض نے مجھے کہا تھا کہ یہ راستے میں ہی ٹوٹ جائیں گے۔ لیکن آج ہم واپس جا رہے تھے تو خیال آیا کیوں نہ ان کو ببل پیپر پر ان کی پیکنگ کروائی جائے تاکہ ٹوٹ نہ سکیں۔ ہوٹل میں یہ انڈے بے انتہا مہنگے تھے۔ میرا لینے کے لیے دل بھی مچلتا تھا سو ہوٹل کی سیل گرل نے ہی یہاں کا پتہ دیا تھا۔

میں سووینیر کی بہت بڑی دکان پر کھڑی تھی۔ اس دکان میں عمر رسیدہ لیڈی کھڑی تھی۔ شاید وہ اس کی مالکن تھی۔ میں نے انڈوں کی قیمت معلوم کی تو ہوٹل کی نسبت بہت کم تھی۔ انہیں کم کرنے کے لیے کہا تو اس نے کہا کہ فکس پرائس رکھی ہیں۔ وقت بھی تھوڑا تھا تکرار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں نے اس خاتون کو انڈا پسند کر کے پیک کرنے کے لیے کہا' تو اس نے سیل گرل جو سیاہ فام تھی اسے بلوا کر کہا کہ اسے ببل پیپر میں اچھی طرح ریپ کر دو' پاکستان لے جانا ہے انہوں نے۔

میں نے اس خاتون سے پوچھا۔ ''آپ کب سے ہیں یہاں پر؟''

''میں۔۔۔۔۔۔۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں نے تو آنکھیں یہاں ہی کھولی ہیں۔ میرے آباء واجداد انڈیا کے ہیں۔ وہ بھی حیات ہیں۔ ہم اسی کو اپنا ملک سمجھتے ہیں۔ بہت سہولتیں ہیں۔ ہمارا مندر بھی گھر کے قریب ہے۔''

''کبھی خیال تو آتا ہوگا کہ اپنے ملک جائیں؟''

''شوق تو ہے' انڈیا دیکھوں پر کوئی بھی اپنا وہاں موجود نہیں ہے۔ ہماری بہت ساری فیملیز یہاں آ کر آباد ہوئی تھیں اور یہیں کی ہو

کر رہ گئی ہیں۔"

جو چیزیں میں نے خریدی تھیں ان کا بل دیا اور دکان سے باہر آ کر شاپنگ پلازہ کے سینٹر میں پہنچ گئی تھی۔ یہاں پر آمنے سامنے بے شمار اسی طرز کی اشیاء تھیں جن کی قیمتیں تقریباً ایک جتنی تھیں' لہٰذا دکان دکان پھرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ ایک دکان میں کوئی چیز پسند آئی تو وہیں ساری شاپنگ کر لی۔

میں ریاض کے ساتھ کھڑی خریداری سے فارغ ہو کر واپس آ رہی تھی کہ ڈرائیور نے آ کر کہا۔

"دو بج رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ڈھائی بجے تک ہوٹل کو خیر باد کر دینا ہے۔"

اس کی بات صحیح تھی۔ میں ایک روز پہلے ہی ساری پیکنگ کر چکی تھی لیکن آخری نظر اور بکس لاک کرنا رہ گیا تھا۔

پانچ منٹ میں ہوٹل پہنچ کر ویٹر کو سامان نیچے لانے کے لیے کہا اور اوپر کمرے میں پہنچ گئی۔ بکس لاک کیا' چھوٹی موٹی چیزیں بیگ میں ڈالیں۔ تب تک ویٹر آن پہنچا تھا۔ سامان کے ساتھ نیچے آئی تو مشہود صاحب ہمیں ائیر پورٹ چھوڑنے کے لیے اور الوداع کرنے کے لیے پہنچ گئے تھے۔

میں گاڑی میں بیٹھی ہوئی ڈربن کی سڑکوں کو آنکھوں میں بند کرنے لگی تھی۔ یہاں اس شہر کا اپنا ہی مزہ تھا۔ حالانکہ کیپ ٹاؤن کے لیے لوگوں نے بہت اکسایا تھا کہ وہاں ضرور جائیں۔ مجھے شاید جوہانسبرگ اور ڈربن دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ ضرور خوبصورت ہوگا۔ مگر ایک ملک کا نقشہ ہر شہر کے لیے ایک جیسا ہوتا ہے۔ پاکستان جانے کی جلدی بھی تھی۔ حالانکہ ہم اتنے زیادہ دن ساؤتھ افریقہ میں نہیں ٹھہرے تھے۔ لیکن انگریزی کا محاورہ ہے۔

East or West, Home is the Best

جو اپنے ملک میں رہنے کا مزہ ہے دنیا کے کسی بھی ملک میں چلے جائیں آپ کو کہیں بھی اپنے ملک اور گھر جیسا آرام نہیں ملتا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ لوگ باہر کے ملکوں میں جا کر باہر کے کیوں ہو جاتے ہیں۔ پھر پاکستان آنے کے لیے ان کے ذہنوں میں خوف سا جاتا ہے۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ جہاں ہیں بس وہیں ٹکے رہیں۔ شاید وہ اپنا کاروبار اتنا وسیع کر لیتے ہیں کہ واپس آنا محال ہو جاتا ہے۔

ان ہی خیالات کے تانے بانے میں الجھی میں اپنے وطن پاکستان کے شہر اسلام آباد پہنچ گئی۔ وہی میرے لیے گوشہ عافیت تھا۔

◆◆◆